الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

اندھیرا آئے تو اندھیرے کو نہ کوسئے، چراغ جلا دیجئے
اس کے بعد اندھیرا خود بخود ختم ہو جائے گا ——

شمارہ ۲۱	زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے	قیمت فی پرچہ
	خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے	
جون ۱۹۷۹	بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی	دو روپے

الرسالہ

شمارہ ۳۱ جون ۱۹۷۹

جمعیۃ بلڈنگ • قاسم جان اسٹریٹ • دہلی ۶

دہرا نقصان ۔۔۔۔

"جیٹ جہاز کیا ہے" طالب علم سے یہ سوال پوچھا جائے اور اس کے جواب میں وہ جیٹ جہاز کی تفصیلات بتانے لگے تو امتحان کے ایک اصول کے مطابق اس کے نمبر کم کر دیئے جائیں گے۔ یعنی سوال اگر پانچ نمبر کا تھا تو غلط جواب کی وجہ سے اس کے دس نمبر کاٹ لئے جائیں گے کیونکہ غلط جواب اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہ نہ صرف نیٹ جہاز سے ناواقف تھا بلکہ جیٹ جہاز کو بھی نہیں جانتا تھا۔ امتحان کے اس اصول کو نمبر کی نفی (Minus Marking) کہتے ہیں۔

بعض امتحانات میں نمبر کی نفی کا جو طریقہ رائج ہے، وہ زندگی کے معاملہ میں بھی نہایت بے رحمی کے ساتھ کارفرما ہے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ غلط اقدام کر بیٹھے تو صرف اتنا ہی نہیں ہوگا کہ وہ منزل پر نہیں پہنچے گا۔ بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ منزل سے دور ہو جائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مغرب کی نماز کے بعد میں مسجد سے نکلا تو ایک صاحب سیڑھیوں پر اپنے جوتے کا فیتہ کس رہے تھے۔ وہ ابھی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تھے۔ وہ ایک معروف کارخانہ دار ہیں۔ برسوں سے وہ کبھی مسجد میں نظر نہیں آئے تھے۔ میں حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ بول پڑے: "یہ الرسالہ کا ظہور ہے"۔ انھوں نے بتایا کہ عرصہ ہوا ایک صاحب مجھے الرسالہ کے چند پرچے دے گئے تھے۔ میں نے ان کو پڑھے بغیر الماری میں ڈال دیا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ میں بیمار پڑا۔ ایک روز جب کہ میں بستر پر لیٹا ہوا تھا، وقت گزاری کے لئے الرسالہ کے پرچے نکالے اور ان کو دیکھنے لگا۔ چند ہی صفحات دیکھے تھے کہ اس کی کشش نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ میں نے سارے پرچے پڑھ ڈالے۔ اب ہر مہینے باقاعدہ خرید کر اس کو پڑھتا ہوں۔ الرسالہ اب میری زندگی کا جزء بن چکا ہے۔ اور اسی کا یہ کرشمہ ہے کہ میرے جیسا آزاد خیال آدمی آج پانچوں وقت مسجد میں آکر نماز ادا کر رہا ہے۔

الرسالہ کی ڈاک میں تقریباً روزانہ اس قسم کے خطوط ہوتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ الرسالہ اپنے قارئین کے حلقہ میں دینی جذبات کو جگانے اور دین دار زندگی پیدا کرنے میں بفضلہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔ اب اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پڑھنے والے بڑھیں۔ ہم اپنے ہمدردوں کے سامنے دوبارہ اس اپیل کو دہرائیں گے کہ وہ الرسالہ کی ایجنسی کو اپنی زندگی میں ایک ضروری جزء کی حیثیت سے شامل کر لیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس دینی لہر کو آگے بڑھانے کا سب سے مؤثر طریقہ ہے اور ہر شخص کم از کم پانچ پرچے کی ایجنسی بآسانی چلا سکتا ہے۔ الرسالہ کی ایجنسی عام معنوں میں صرف ایجنسی نہیں ہے بلکہ یہ ایک عملی پروگرام ہے جس کے ذریعہ اس تعمیری آواز کو پھیلایا جا سکتا ہے۔

وہ قیمت جو ادا نہیں کی گئی

بائبل میں ہے "میں نے طرب کیا، تو نے رقص نہ کیا" کائنات ایک عظیم نمائش گاہ ہے۔ وہ قدرت اور حکمت اور معنویت کا ایک اتھاہ کارخانہ ہے۔ وہ اس قدر حسین ہے کہ اس کے حسن کو کسی بھی طرح لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کائنات اپنے تمام جلووں کے ساتھ خدا کی ابدی طرب گاہ ہے۔ تاہم معلوم کائنات میں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جو اس طرب گاہ کو سمجھ سکتا ہے اور اس کو دیکھ کر اس کے جمال و کمال پر رقص کر سکتا ہے۔ مگر یہی واحد مخلوق جس کو خدا نے اپنے دست خاص سے اس لئے بنایا تھا کہ وہ کائنات کی بے پناہ فن کاریوں کو دیکھے اور اس سے بے خود ہو کر رقص کرنے لگے، وہی سب سے زیادہ اس سے اعراض کرتا ہے۔ انسان سب کچھ کرتا ہے مگر وہی کام نہیں کرتا جس کو اسے سب سے زیادہ کرنا چاہئے۔

تمام مخلوقات میں صرف انسان کو اس قسم کا احساس و شعور دینا ظاہر کرتا ہے کہ انسان سے اس کے خدا کو کیا مطلوب ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کے "طرب پر رقص کرے"۔ وہ کائنات میں خدا کے کرشموں کو اس طرح پائے کہ اس پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جائے۔ وہ بے اختیار پکار اٹھے: فتبارک اللہ احسن الخالقین (کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے) انسان کی اصل قیمت یہی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو گویا وہ اس کائنات میں اپنے آپ کو بے قیمت کر رہا ہے۔ وہ اپنے وجود کو بے معنی بنا رہا ہے۔ خدا نے ایک عظیم آفاقی اسٹیج بنایا اور اس میں اپنے بہترین جلووں کے ساتھ ظاہر ہوا۔ اور یہ سب کچھ جس کے لئے کیا گیا وہ وہی تھا جس کو انسان کہا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان اگر اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلے، اگر اس کی طرف سے حمد کا ظہور نہ ہو تو یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی جو سزا بھی دی جائے وہ کم ہوگی۔

خدا کی دنیا بے حد حسین ہے۔ وہ جنت کی فضاؤں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ خدا کے جمال و کمال کا آئینہ ہے۔ مگر انسان اس کے حسن کو دیکھ نہیں پاتا۔ انسان کے جہنمی سائے نے اس کو ڈھانپ رکھا ہے۔ کائنات کو اس کے جنتی روپ میں دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے بنائے ہوئے جھوٹے خول سے باہر آئے۔ وہ "انسانی دنیا" سے اوپر اٹھ کر خدائی دنیا میں جھانک سکے۔ انسان اپنے خول سے باہر نکلنے پر تیار نہیں ہوتا، اس لئے وہ خدا کی دنیا کو دیکھ بھی نہیں پاتا۔

وہی انسان انسان ہے جو تمام دیکھی جانے والی چیزوں سے زیادہ کائنات کو دیکھے۔ کائنات کے آئینہ میں اس کو خدا کا جلوہ نظر آنے لگے۔ جب کسی بندۂ خدا پر یہ تجربہ گزرتا ہے تو اس کا وہ حال ہوتا ہے جس کو انسانی لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی زبان خدائی حمد و ثنا میں تر رہنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے نور میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کے الفاظ جواب دینے لگتے ہیں۔ اس کا شدت احساس آنکھوں کی راہ سے بہہ نکلتا ہے۔ خدا کی خدائی کے اعتراف میں اس کا پورا وجود خاکستر ہو جاتا ہے۔

انسان اپنے آپ میں اتنا مشغول ہے کہ اس کو خدا کی خدائی کی خبر نہیں۔ وہ اپنی "مصنوعات" میں اتنا الجھا ہوا ہے کہ اس کو خدا کی مصنوعات دکھائی نہیں دیتیں۔ وہ اپنے جلووں میں اتنا گم ہے کہ اس کو خدا کے جلوے نظر نہیں آتے۔ انسان کی سب سے بڑی محرومی یہی ہے اور جو شخص دنیا میں محروم ہو وہ آخرت میں پانے والا کس طرح بن سکتا ہے۔ ■

یہ وقت ہر شخص کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے

موت ہر ایک پر آتی ہے۔ کوئی اس سے بچ نہیں سکتا۔ تاہم موتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جب کہ آدمی اللہ کو اپنا مقصود بنائے ہوئے ہو۔ وہ اللہ کے لئے بولتا ہو اور اللہ کے لئے چپ ہوتا ہو۔ اس کی توجہ تمام تر آخرت کی طرف لگی ہوئی ہو۔ ایسے آدمی کے لئے موت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف سفر کر رہا تھا اور موت کے فرشتہ نے اس کے سفر کو مختصر کر کے اس کو اس کی منزل تک پہنچا دیا۔

دوسرا آدمی وہ ہے جس نے اپنے مالک کو بھلا رکھا ہے۔ اس کا کہنا اور اس کا چلنا اللہ کے لئے نہیں ہوتا۔ وہ اپنے رب کو چھوڑ کر کسی اور طرف بھاگ رہا ہے۔ ایسے شخص کے لئے موت کا دن اس کی گرفتاری کا دن ہے۔ اس کی مثال اس باغی کی سی ہے جو چند دن سرکشی دکھلائے اور اس کے بعد اس کو پکڑ کر عدالت میں حاضر کر دیا جائے

بظاہر ایک ہی موت ہے جو دونوں آدمیوں پر آتی ہے۔ مگر دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا پھول اور آگ میں۔ ایک کے لئے موت رب العالمین کا مہمان بننا ہے اور دوسرے کے لئے موت رب العالمین کے قید خانہ میں ڈالا جانا۔ ایک کے لئے موت جنت کے باغوں میں داخلہ کا دروازہ ہے اور دوسرے کے لئے موت وہ دن ہے جب کہ اس کو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا جاتا ہے تاکہ اپنی سرکشی کے جرم میں وہاں وہ ابدی طور پر جلتا رہے۔

مومن اور غیر مومن کی تعریف یہ ہے کہ مومن وہ ہے جس کی نگاہیں موت کے مسائل کی طرف لگی ہوئی ہوں، جو موت کے بعد آنے والی دنیا میں عزت حاصل کرنے کو اپنی تمام توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہو۔ اس کے برعکس غیر مومن وہ ہے جو زندگی کے مسائل میں الجھا ہوا ہو، جو موجودہ دنیا میں عزت اور کامیابی حاصل کرنے کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہو۔ آج کے حالات میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کامیاب وہی ہے جو موجودہ دنیا میں اپنی جڑیں مضبوط کئے ہوئے ہو۔ مگر موت اس فریب کو مکمل طور پر ڈھا دے گی۔ اس کے بعد اچانک یہ معلوم ہوگا کہ وہی شخص مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہوا تھا جس کو دنیا والوں نے بے بنیاد سمجھ لیا تھا اور وہ تمام لوگ بالکل بے حقیقت تھے جو موت سے پہلے کے حالات میں بظاہر عزت اور ترقی کی بلندیوں پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ موت ہر چیز کو باطل کر دے گی اور اس کے بعد وہی چیز بچے گی جس کی عالم آخرت میں کوئی قیمت ہو ——— انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہر آن موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم چند سال (مشکل سو سال) موجودہ دنیا میں زندگی گزار کر موت کے بعد والی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس دوسری دنیا میں کامیاب ہونا ہی حقیقی کامیابی ہے اور وہاں ناکام ہونا ہی حقیقی ناکامی۔ ■

وہ جنت کو چھوڑ کر جہنم کو لے رہے ہیں

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ

(یونس ۹-۷)

جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور وہ دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں، اور جو ہماری نشانیوں سے بے پروا ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانا آگ ہے ان کے اعمال کی وجہ سے۔ جو لوگ یقین لائے اور نیک کام کیا ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے ان کو راہ دے گا جنت کی، ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی آرام کے باغوں میں۔

انسانوں کی ایک قسم وہ ہے جن کو دنیا کی چیزیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ پیسہ کے فریب میں ہوتے ہیں۔ ان کو نظر آتا ہے کہ پیسہ سب کچھ ہے، اس لئے وہ پیسہ کمانے اور اس کے مسائل سے نمٹنے میں محو رہتے ہیں۔ کچھ لوگ شہرت و عزت کے فریب میں ہوتے ہیں۔ ان کی دلچسپیوں کا مرکز و محور وہ چیزیں بن جاتی ہیں جن سے ان کی امیج بڑھے، جن سے ان کی عوامی تصویر میں اضافہ ہو۔ کچھ لوگ اقتدار کے فریب میں ہوتے ہیں۔ ان کی توجہ اپنے اقتدار کے مسائل میں لگی رہتی ہے۔ یہ تمام لوگ اپنی دنیوی زندگی میں اتنا گم ہو جاتے ہیں کہ ان کے ذہن و فکر کی تمام طاقتیں اسی پر لگ جاتی ہیں۔ وہ انھیں چیزوں کے اندر جینے لگتے ہیں۔ ان کو دنیا میں جو کچھ مل رہا ہے، اسی پر وہ راضی اور مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ ذہنی کیفیت ان کو آخرت کی طرف سے غافل کر دیتی ہے۔ ان کی زندگی ایسی بن جاتی ہے جیسے انھیں اللہ سے ملاقات کا کھٹکا ہی نہ ہو، جیسے وہ اس اندیشہ سے خالی ہو گئے ہوں کہ ہار اور جیت، کامیابی اور ناکامی کا اصل فیصلہ اللہ کے یہاں ہونے والا ہے۔ ان کی غفلت یہاں تک بڑھتی ہے کہ خدا کے دلائل ان کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں مگر وہ بے پروائی کے ساتھ ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دنیا میں ان کے معاملات کا درست ہونا ان کو اس غلط فہمی میں ڈال دیتا ہے کہ کسی دلیل اور ثبوت پر ان کو دھیان دینے کی ضرورت نہیں۔ خدا کی بات لفظوں یا خاموش اشاروں کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مال و جائداد، عزت و شہرت اور عہدہ و اقتدار ایسی مادی صورتوں میں ہوتے ہیں جن کے مزے کو وہ چکھ رہے ہوں، جن کی اہمیت کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ "حقیر" کو چھوڑ کر "بڑی چیز" کو لے رہے ہیں۔ مگر حقیقۃً وہ جنت کو چھوڑ کر جہنم کو لے رہے ہوتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں ان کی مدہوشی ان کو یہ بات سمجھنے نہیں دیتی۔ مگر مرنے کے بعد جب وہ اپنے سامنے جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھیں گے، اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں وہ جو کچھ کر رہے تھے اس کی حقیقت آخرت کے اعتبار سے کیا تھی۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جو خدا پر اس وقت سے پہلے یقین لے آتے ہیں جب کہ وہ اپنی طاقتوں اور عظمتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا۔ ان کا یہ یقین ان کو صحیح اور درست رویہ پر قائم رکھتا ہے۔ وہ اپنی کوششوں اور سرگرمیوں

کو آخرت کی بنیاد پر چلاتے ہیں نہ کہ دنیا کی بنیاد پر۔ اللہ پر ان کا یقین ان کی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ ان کا ایمان اور عمل صالح ان کو ان نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک کر دیتا ہے جو کسی معاملہ میں حق کے پہلو کو سمجھنے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ جب اللہ کی کوئی نشانی ظاہر ہوتی ہے تو وہ اس کو پہچان لیتے ہیں۔ جب اللہ کی کوئی دلیل سامنے آتی ہے تو اس کی معقولیت کو سمجھنے میں انھیں دیر نہیں لگتی۔ جب خدائی اشارے اپنی خاموش زبان میں بولتے ہیں تو ان کے کان ان کو سننے کے لئے بہرے ثابت نہیں ہوتے۔ اس طرح ان کا زندہ ایمان ان کو خدائی راستہ پر چلاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ان کو جنت میں پہنچا دیتا ہے جہاں وہ خوشیوں کے سرسبز باغوں کے اندر رہتے ہوئے بہترین مکانات میں ہمیشہ رہیں گے۔

انسان کے لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ اپنے رب کو پکڑے اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے۔ مگر موجودہ دنیا میں آدمی کو اس طرح رکھا گیا ہے کہ خدا اس کے سامنے موجود نہیں ہے۔ یہاں خدا کا ظہور آیات کی صورت میں ہوا ہے۔ آخرت میں خدا اپنی بے حجاب صورت میں نمایاں ہوگا، حتیٰ کہ لوگ اس کو چاند اور سورج کی طرح دیکھیں گے۔ مگر موجودہ دنیا میں وہ دلائل اور نشانیوں کے ذریعہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں آدمی کو خدا کی کتاب میں خدا کو پانا ہے۔ قدرت کے پھیلے ہوئے کرشموں میں خدا کو دیکھنا ہے۔ خدا کی طرف پکارنے والے انسانوں کی آواز میں خدا کی آواز کو سننا ہے، جو شخص اس طرح خدا کو پائے، اسی نے خدا کو پایا۔ وہی خدا کا مومن بنا۔

یہی موجودہ دنیا میں آدمی کا اصل امتحان ہے۔ اگرچہ یہ بڑا سخت امتحان ہے۔ یہ "غیب" کو شہود بنانا ہے۔ خدا کے ظاہر ہونے سے پہلے ہی اس طرح اس کا مومن بن جانا ہے جیسے کہ وہ اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو چکا ہے۔ لیکن اگر ایک بار آدمی اپنے آپ کو اس مقام پر پہنچا دے تو خدا اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ وہ اس کی رہنمائی اور مدد کے لئے اتر آتا ہے۔ خدا اس وقت تک ہم سے الگ کھڑا رہتا ہے جب تک ہم غیب کے پردہ سے گزر کر اس کی طرف نہ لپکیں۔ مگر جب ہم اس کی طرف لپکتے ہیں تو اس کے بعد وہ ہم سے الگ نہیں رہتا۔ اب وہ ہمارا ہم نشین بن جاتا ہے۔ "اب وہ مومن کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے۔ وہ مومن کا ہاتھ بن جاتا ہے جس سے وہ پکڑتا ہے، وہ مومن کا پاؤں بن جاتا ہے جس سے وہ چلتا ہے" جو ایک بار خدا کا دامن پکڑ لے، خدا خود ضامن بن جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے اب خدا کا دامن کبھی نہ چھوٹے گا، وہ کبھی اپنے رب سے محروم نہ ہوگا۔ الایہ کہ اس نے خدا کا دامن نہ پایا ہو، وہ کسی اور دامن کو خدا کا دامن سمجھ بیٹھا ہو۔

"ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے ان کو جنت تک پہنچا دے گا"۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں داخلہ کسی آدمی کو اپنے ایمانی وجود کی وجہ سے ملے گا نہ کہ اس کے ظاہری کمالات کی وجہ سے۔ جس شخص کی شعوری ہستی اور اس کا اندرونی انسان اس قابل پایا جائے گا کہ جنت کی لطیف اور نفیس دنیا میں اس کو بسایا جائے، اسی کو وہاں بسنے کا اجازت نامہ عطا ہوگا۔ جنت کی دنیا کا شہری وہی شخص بن سکے گا جو اپنے فکر و مزاج اور اپنے کیفیات و رجحانات کے اعتبار سے وہاں کی آبادکاری کے لئے موزوں ثابت ہو۔ جن لوگوں کے اندر یہ اعلیٰ "انسان" نہ پایا جائے گا ان کو جنت کے ماحول سے دور پھینک دیا جائے گا جہاں وہ ابد تک عذاب کے اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے۔۔۔۔ جنت طیب روحوں کی آبادکاری کا مقام ہے اور جہنم خبیث روحوں کا قید خانہ۔ ■

جب کائنات اپنا بیان دے گی

مجھے ایک بار لکھنؤ کے ایک علاقہ میں جانا ہوا جہاں آم کے باغات تھے۔ میں نے دیکھا کہ درختوں پر پھل لگے ہوئے ہیں مگر سب کے سب کالے ہو رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دھوئیں کی وجہ سے کالے ہو گئے ہیں۔ ان باغات کے پاس اینٹ کے بھٹے تھے جن کی چمنیوں سے ہر وقت کوئلہ کا دھواں نکلتا رہتا تھا۔ اس دھوئیں کی وجہ سے تمام پھل کالے ہو کر خراب ہو گئے۔ ان کی بڑھوتری رک گئی۔ وہ منڈی میں بھیجنے کے قابل نہ رہے۔

یہی اس دنیا کی تمام چیزوں کا حال ہے۔ دنیا کے بنانے والے نے اس کو نہایت حکمت کے ساتھ بنایا ہے۔ اس کی ہر چیز بے حد نازک اور لطیف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات ایک انتہائی بامعنی کارخانہ ہے۔ وہ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرتی جو اس کے مزاج کے خلاف ہو، جو اس کی تخلیقی اسکیم کے مطابق نہ ہو۔ مگر کائنات کے سب سے زیادہ سرسبز اور قیمتی حصہ پر انسان ہر وقت ظلم و فساد جاری کئے ہوئے ہے۔ حق کے نام پر حق کو قتل کیا جا رہا ہے۔ اور کائنات اپنی تمام معنویت کے باوجود خاموش کھڑی ہوئی ہے۔ وہ زمین پر سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھتی ہے مگر اس کے بارے میں اپنا کوئی بیان نہیں دیتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے خدا نے ایک مقرر مدت تک کے لئے اس کو روک رکھا ہے۔ جب یہ مدت ختم ہو گی تو اچانک وہ بول پڑے گی۔ اس وقت وہ سب کچھ کہہ ڈالے گی جس کو آج وہ دیکھتی ہے مگر نہیں کہتی۔

آدمی اپنے اقتدار کی سیاست چلاتا ہے اور اس کو خدا کی سیاست کا نام دیتا ہے۔ وہ مکمل اصلاح کے نفاذ کا نعرہ لگاتا ہے اور جب آزمایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جزئی اصلاح پر بھی قائم نہیں۔ وہ اپنے پڑوسی کو ستاتا ہے اور دور کے ظالم کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنی انا کی پرستش میں لگا ہوتا ہے اور دوسرے کی انانیت اور تعصب کا اعلان کرنے کے لئے اسٹیج سجاتا ہے۔ وہ مفاد پرستی اور استحصال میں غرق ہوتا ہے اور انصاف اور انسانیت کے عنوان پر تقریریں کرتا ہے۔ وہ ضد اور نفرت اور انتقام کے تحت کارروائی کرتا ہے اور زبان سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ صرف حق کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ وہ اپنے بدترین شیطانی کاموں کو بیان کرنے کے لئے بھی نہایت خوب صورت الفاظ پا لیتا ہے۔ یہ سب کچھ انسانی دنیا میں ہو رہا ہے اور کائنات اپنی تمام نفاست اور لطافت کے باوجود چپ رہتی ہے۔ وہ سچ کو سچ نہیں کہتی اور جھوٹ کے جھوٹ ہونے کا اعلان نہیں کرتی۔

کیا کائنات کے اندر تضاد ہے، کیا یہ ایک گونگی کائنات ہے۔ جس کائنات کے پاس سریلے نغمے بکھیرنے والی چڑیاں ہوں، کیا اس کے پاس حق کا اعلان کرنے کے لئے زبان نہیں۔ قرآن اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ کائنات کی یہ خاموشی اس لئے ہے کہ خدا نے اس کو قیامت کے آنے تک خاموش رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔ جیسے ہی صور پھونکا جائے گا تمام زبانوں کی مہریں ٹوٹ جائیں گی۔ اس وقت ساری کائنات ایک عظیم الشان ٹیپ ریکارڈ بن جائے گی اور پھر خدا کے گواہ کی حیثیت سے وہ سب کچھ بتائے گی جو حق اور عدل کے مطابق اسے بتانا چاہئے۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہو گا کہ جس کائنات کے پاس رات کو دن بنا دینے والا سورج تھا اس کے پاس یہ بھی انتظام تھا کہ تاریکی میں چھپے ہوئے اعمال کو اجالے میں لا سکے۔

حقیقی دین داری کیا ہے؟

ولکل امۃ جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ علیٰ ما رزقھم من بھیمۃ الانعام فالٰھکم الٰہ واحد فلہ اسلموا وبشر المخبتین الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم والصابرین علیٰ ما اصابھم والمقیمی الصلوٰۃ ومما رزقنٰھم ینفقون والبدن جعلنٰھا لکم من شعائر اللہ لکم فیھا خیر فاذکروا اسم اللہ علیھا صواف فاذا وجبت جنوبھا فکلوا منھا واطعموا القانع والمعتر کذٰلک سخرنٰھا لکم لعلکم تشکرون لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولٰکن ینالہ التقویٰ منکم کذٰلک سخرھا لکم لتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم وبشر المحسنین

(حج ۳۷-۳۴)

اور ہر امت کے لئے ہم نے قربانی کرنا مقرر کیا تاکہ وہ اللہ کا نام لیں ان چوپایوں پر جو اس نے ان کو دئے ہیں۔ اللہ ہی تمھارا ایک اللہ ہے، تم اسی کے ہوکر رہو اور خوش خبری دے دو عاجزی کرنے والوں کو۔ وہ لوگ کہ جب اللہ کو یاد کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور وہ سہنے والے ہیں جو ان پر پڑے۔ اور نماز قائم رکھنے والے ہیں اور ہمارے دئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور قربانی کے جانور کو ہم نے تمھارے لئے اللہ کی نشانی بنایا ہے۔ اس میں تمھارا بھلا ہے۔ پس تم ذبح کے وقت ان پر اللہ کا نام لو۔ جب وہ ذبح ہو جائیں تو تم خود بھی کھاؤ اور بے سوال کو اور سوال کرنے والے کو کھلاؤ۔ ہم نے ان جانوروں کو تمھارے تابع کر دیا ہے تاکہ تم شکر کرو۔ اللہ کو ان کا گوشت اور ان کا خون نہیں پہنچتا۔ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمھارے بس میں کر دیا ہے تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ سجھائی اور خوش خبری دے دو نیکی کرنے والوں کو۔

ایک شخص ہے، اس نے قیمت دے کر ایک جانور خریدا اور قربانی کے دن منتر کی طرح کچھ رٹے ہوئے جملوں کو پڑھ کر اس کو ذبح کر لیا۔ گوشت کا کچھ حصہ خود کھایا، کچھ دوسروں کو دے دیا۔ خریداری کے وقت سے لے کر گوشت کھانے تک قربانی کے نام سے جو چیز اس نے جانی وہ بس ایک جانور تھا یا اس کا گوشت و خون۔ اس کی روح نے اس کے سوا کسی اور چیز کا تجربہ نہیں کیا۔

دوسرا شخص وہ ہے جس نے خدائیت کے جذبہ سے ایک جانور لیا۔ جب وہ اس کو مذبح کی طرف لے کر چلا تو اس کا دل کہہ رہا تھا: خدایا! میں جانور کو نہیں خود اپنے آپ کو تیری طرف لے کر آ رہا ہوں۔ جب اس نے جانور کو مقررہ طریقہ پر ذبح کیا تو اس کی زبان سے نکلا: "خدایا! یہ میری اپنی جان کا ہدیہ ہے جو میں جانور کی جان کی صورت میں تجھ کو پیش کر رہا ہوں۔ تو اس کو قبول کرلے"۔ جانور کی قربانی کے معاملہ نے اس کو اس قربانی کے معاملہ کو یاد دلایا جو بندے کی طرف سے خالق کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے اور جانور کی قربانی اس کی صرف ایک ظاہری علامت ہے۔ قربانی کے دوران اس کا دل پگھلتا رہا۔ اس کی آنکھیں آنسو بہاتی رہیں۔ قربانی اس کے اندر نرمی پیدا کر کے ہر قسم کے برے جذبات کو نکالتی رہی۔ وہ کبر، عداوت، انتقام اور خود نمائی کے جذبات کو اللہ کے لئے قربان کرتا رہا —— جو شخص گوشت اور خون کی سطح پر رہا اس نے گویا اپنے اللہ کو قربانی کا صرف گوشت اور خون بھیجا اور جو شخص قربانی کے دوران تقوی کا تجربہ کرتا رہا اس نے گویا اپنے اللہ کو قربانی کا تقوی بھیجا۔ اور تقوی ہی وہ چیز ہے

جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے، اس کو ہمارے گوشت اور خون کی ضرورت نہیں۔

یہی معاملہ پورے دین کا ہے۔ دین کا ایک "گوشت اور خون" ہے اور دین کا ایک "تقویٰ" ہے۔ ایک اس کا چھلکا ہے اور ایک اس کا مغز ہے۔ اللہ کو مغز کی ضرورت ہے نہ کہ چھلکے کی۔ جو لوگ چھلکے کی سطح پر دین کو پائیں، انھوں نے ایسے دین کو پایا جو دنیا کی زندگی میں خواہ دین نظر آئے مگر آخرت میں خدا کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ آخرت میں انھیں لوگوں کا دین قیمت والا ہوگا جنھوں نے مغز کی سطح پر دین کو پایا ہو۔

کچھ لوگ ایمان اور ذکر اور تلاوت اور نماز کا چرچا کرتے ہیں اور اس میں مشغول ہوتے ہیں۔ بظاہر وہ اچھا دینی کام کر رہے ہیں لیکن اگر ان کا حال یہ ہو کہ ایمان ان کے لئے زبان سے کچھ الفاظ بول دینے کا نام ہو۔ ذکر یہ ہو کہ گنتی کا ایک نصاب مقرر کیا جائے اور کچھ مقرر الفاظ کو اس کے مطابق صبح و شام دانوں پر شمار کر لیا جائے۔ تلاوت کا مطلب ان کے لئے یہ ہو کہ کتاب اللہ کے الفاظ کو، کسی غور و فکر کے بغیر، محض مخارج کی صحت کے ساتھ دہرا لیا جائے۔ نماز سے ان کو جو چیز ملے وہ بس یہ ہو کہ مقررہ وقت پر کچھ مقررہ اعمال کو اعضا و جوارح کے ذریعہ ادا کر لیا۔ اگر ان کا حال یہ ہو تو گویا انھوں نے دین کے نام پر "گوشت اور خون" کا تحفہ اپنے رب کو بھیجا، وہ تقویٰ کا تحفہ اس کو نہ بھیج سکے۔ اور معلوم ہے کہ اللہ کو تقویٰ کا تحفہ مطلوب ہے نہ کہ گوشت اور خون کا۔

اسی طرح کچھ لوگ مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کا نعرہ لگائیں۔ مگر ان کا مکمل اسلام عملاً جس چیز کا نام ہو وہ یہ کہ کوڑے اور پھانسی کی سزائیں جاری کی جائیں۔ اور اسی طرح کے کچھ اور حکومتی قوانین کے اجراء کا اعلان کر دیا جائے۔ ان کا مکمل اسلام ان کو بس خارجی اور ظاہری چیزیں دے۔ وہ ان کو نہ اللہ کی قربت کا تجربہ کرائے اور نہ دل کی گھلاوٹ کا۔ وہ نہ آدمی کو کبر اور انانیت سے خالی کرے اور نہ انتقام اور عداوت کے جذبات سے۔ وہ نہ ان کو نفسیاتی پیچیدگیوں سے بلند انسان بنائے اور نہ یہ مزاج بنائے کہ وہ دوسروں کے لئے وہی پسند کریں جو خود اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ وہ دوسروں پر شرعی سزائیں نافذ کرنے کا نعرہ لگائیں مگر خود لفظی تنقید کو بھی برداشت نہ کریں۔ ان کے اندر حقیقی معنوں میں نہ خدا کا خوف ابھرے اور نہ بندوں کی خیرخواہی۔ اگر ایسا ہو تو کہا جائے گا کہ انھوں نے اسلامی نظام کا صرف "گوشت اور خون" پایا ہے، اسلامی نظام کا "تقویٰ" پانے میں وہ ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

اسی طرح جو لوگ دین کی ان شکلوں پر دوڑیں جن میں عوامی بھیڑ جمع ہوتی ہے۔ جن سے چندے اور نذرانے وصول ہوتے ہیں۔ جن سے سستی قیادت حاصل ہوتی ہے جن سے اخباری شہرت ملتی ہے، جن سے اعزازات اور مناصب کے دروازے کھلتے ہیں۔ جن کے ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک شان دار جلسہ میں معزز مہمان بن کر جائے اور ایک لفظی تقریر کر کے خدمت اور عمل کا کریڈٹ حاصل کرے۔ ایسے لوگ "گوشت اور خون" کی سطح پر دین داری دکھا رہے ہیں۔ جب کہ تقویٰ کی سطح پر دینداری یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو توڑے اور سچائی کے آگے اپنے کو جھکائے۔ خدا کو اشتہاری دین داری مطلوب نہیں ہے بلکہ وہ دینداری مطلوب ہے جو تقریری اسٹیج پر نہیں بلکہ خاموش عمل کے میدان میں ہوتی ہے۔ جہاں آدمی دوسرے سے زیادہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ جب وہ نفس پر چوٹ برداشت کرتے ہوئے دوسرے کو اس کا حق ادا کرتا ہے۔

خوش خیالیاں حقیقت کا بدل نہیں بن سکتیں !

سڑک پر مجمع ۲۱ نمبر کی بس کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک بس آتی دکھائی دی اور سارے لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ "اوہ! یہ تو ۱۲ نمبر کی بس ہے۔" بورڈ دیکھ کر ایک شخص بولا۔ "۱۲ کو ۲۱ کر لو اور چلے جاؤ۔" دوسرے نے کہا۔
ظاہر ہے کہ یہ صرف مذاق تھا۔ کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا کہ کھریا مٹی لے کر بس پر اپنا مطلوبہ نمبر لکھے اور اس پر بیٹھ کر سمجھے کہ اب وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ یہ ہندسہ کا فرق نہیں، حقیقت کا فرق تھا۔ اور حقیقت کے فرق کو ہندسہ کے فرق سے بدلا نہیں جا سکتا —— یہ بات اپنی ذاتی زندگی کے معاملات میں ہر شخص جانتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ملت کے رہنما جب ملت کا مسئلہ حل کرنے کے لئے اٹھتے ہیں تو وہاں وہ اس انتہائی معلوم حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہندسہ کو بدل کر وہ اس کام کا کریڈٹ حاصل کر لیں جو صرف حقیقت کو بدلنے کے نتیجہ میں کسی کو ملتا ہے۔
ایک ایسا سماج جہاں امتیاز اور لیاقت کی بنیاد پر لوگوں کو درجات ملتے ہیں، ہم مراعات اور تحفظات کے عنوان پر کانفرنس کر رہے ہیں۔ ایک ایسا نظام جہاں علمی اور اقتصادی طاقت کے بل پر قوموں کے فیصلے ہوتے ہیں، ہم احتجاج اور مطالبات کے پوسٹر دیواروں پر چپکا رہے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں زبان و بیان نے بالکل نیا انداز اختیار کر لیا ہے، ہم اپنے روایتی کتب خانہ کے بورڈ پر "دورِ جدید" کا لفظ لکھنے کے لئے آرٹسٹ کی خدمات حاصل کر رہے ہیں۔ ایک ایسا زمانہ جہاں عالمی ذہن نے سیاست کو سیکولر بنیادوں پر قائم کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے، ہم عوام کا ذہن بدلے بغیر بیلٹ بکس سے اسلامی نظام برآمد کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک ایسی آبادی جہاں اختلاف اور شکایت کے گہرے مادی اسباب موجود ہیں، ہم لفظی تقریروں کے کرشمے دکھا کر حالات کو درست کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں ہم تعلیم، اقتصادیات، باہمی اتحاد ہر لحاظ سے تمام گروہوں میں سب سے پیچھے ہیں، ہم جلسوں اور کنونشنوں کے ذریعہ ملک کی قسمت بدلنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ ایک ایسا جغرافیہ جہاں ہمارے پاس اپنے تحفظ کی بھی طاقت نہیں، ہم "حریف کو نقصان پہنچاؤ" کا طریق کار اختیار کر کے باعزت زندگی حاصل کرنے کی تجویزیں پیش کر رہے ہیں۔ اس قسم کی تمام باتیں اسی طرح بے معنی ہیں جس طرح ۱۲ نمبر کی بس پر ۲۱ نمبر لکھ کر اپنی منزل کی طرف شروع کرنا۔ ■

□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□

دنیا میں مخلص افراد کی کمی نہیں۔ مگر زمین کی پیٹھ شاید ایسے لوگوں سے خالی ہے جو دوسروں کے ساتھ انصاف کرنا جانتے ہوں۔ آدمی اپنے اخلاص میں اتنا گم ہے کہ اس کو دوسرے کے اخلاص کی خبر نہیں۔ اور اگر دوسرے کی طرف سے کوئی اتفاقی تکلیف پہنچ جائے یا کوئی شکایت کی بات ہو جائے، جو اجتماعی زندگی میں بالکل فطری ہے، تو اس کے بعد آدمی کا حال عجیب ہو جاتا ہے۔ دوسرے شخص کا برا ہونا اور خود اپنا برسرِ حق ہونا اس کے لئے اتنا یقینی بن جاتا ہے کہ کوئی بھی دلیل یا کوئی بھی وضاحت اس کے دل کو صاف کرنے میں کامیاب ثابت نہیں ہوتی۔ خوش گمانی کی تمام قسموں کو وہ اپنے لئے خاص کر لیتا ہے اور بدگمانی کی تمام قسموں کو دوسروں کے لئے۔ (۶ مارچ ۱۹۷۹) ■

خدا کا سرا اس وقت آدمی کے ہاتھ آتا ہے جب خدا کی طرف بڑھنے میں دنیا کے سرے اس سے چھوٹ گئے ہوں

حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے شہر اُر میں پیدا ہوئے۔ مخالفین نے جب وہاں رہنا آپ کے لئے ناممکن بنا دیا تو آپ اللہ کے حکم سے عرب کے صحرا میں پہنچے اور مکہ میں بیت اللہ کی تعمیر کی جو اس وقت ایک غیر آباد مقام تھا۔ اس موقع پر آپ کی زبان سے جو دعائیں نکلیں ان میں سے ایک یہ تھی:

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی ذرع عند بیتک المحرم۔ ربنا لیقیموا الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون۔ ربنا انک تعلم ما نخفی وما نعلن وما یخفی علی اللہ من شیئ فی الارض ولا فی السماء (ابراہیم ۳۸)

اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد کو تیرے محترم گھر کے پاس ایک میدان میں بسا دیا ہے جہاں کھیتی نہیں۔ اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز قائم رکھیں۔ پس تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو روزی دے میووں سے۔ تاکہ وہ شکر کریں۔ اے ہمارے رب تو جانتا ہے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں، اور اللہ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا یہ واقعہ ایک علامتی واقعہ ہے۔ یہ تاریخ کی زبان میں بتا رہا ہے کہ ایک بندۂ خدا کے ساتھ اس وقت کیا پیش آتا ہے جب کہ وہ بے آمیز حق کی دعوت کو لے کر کھڑا ہو جائے ـــــــــ وقت کے قائم شدہ نظام میں وہ بے جگہ ہو جاتا ہے، مذہبی ادارے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ دنیا کی ذی زرع وادیاں، اپنی تمام سرسبزی کے باوجود، اس کے لئے خشک ہو جاتی ہیں۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر بے آب و معاشیات کی ایک زمین میں جا بسے اور اپنے رب سے کہے کہ: خدایا! تیرے سوا ان کا کوئی سہارا نہیں۔ انسانوں کی بنائی ہوئی دنیا نے ان کو رزق دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اب تو ان کے قدموں کے نیچے سے ان کے لئے رزق کے چشمے جاری کر دے۔ یہ تاریخ انسانی کا نازک ترین لمحہ ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ کائنات کی نبض رک جاتی ہے۔ زمین و آسمان کی گردشیں نئے حکم کا انتظار کرنے لگتی ہیں۔ انسانی تاریخ نئے تجربہ سے متعارف ہوتی ہے: بیابان میں "چشمے" پھوٹ پڑتے ہیں۔ چھتیں پھاڑ کر خدا کے خزانے اترتے ہیں۔ داعی کی آواز ہواؤں کے دوش پر پھیلنے لگتی ہے۔ خدا اپنی طاقتوں کے ساتھ اپنے ان بندوں کی مدد پر اتر پڑتا ہے جن کو بے حقیقت سمجھ کر دنیا والوں نے اپنی مدد سے محروم کر دیا تھا۔ بے آمیز دعوت کا کام اس آسمان کے نیچے سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ مگر یہی وہ کام ہے جو خدا کی مدد کو سب سے زیادہ کھینچنے والا ہے۔ اگرچہ یہ مدد اس وقت آتی ہے جب کہ دعوت کا اظہار اور اس کی پاداش میں داعی کی مظلومی، دونوں اپنی آخری انتہا پر پہنچ چکے ہوں۔ ■

زیادہ بہتر طور پر

آدمی اگر اپنے آپ سے باخبر ہو جائے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر خدا سے باخبر ہو سکتا ہے

آدمی اگر اپنے آپ کو موت کے کنارے کھڑا ہوا پائے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر زندگی کا مقام حاصل کر سکتا ہے

آدمی اگر اصلاح کا آغاز اپنے آپ سے کرے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر دوسرے کی اصلاح کر سکتا ہے

آدمی اگر چھوٹے مقاصد کو اپنا نشانہ بنائے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر بڑے مقاصد تک پہنچ سکتا ہے

آدمی اگر یہ جان لے کہ اس کو چپ رہنا چاہئے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر بولنے والا بن سکتا ہے۔

آدمی اگر لڑائی کے میدان سے ہٹ جائے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر اپنی لڑائی کو جیت سکتا ہے

آدمی اگر اپنی غلطی کا اعتراف کر لے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر اپنے آپ کو صحیح ثابت کر سکتا ہے

آدمی اگر اپنے جاہل ہونے کا اقرار کر لے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر اپنے عالم ہونے کا ثبوت دے سکتا ہے

آدمی اگر خود اپنے امکانات کو بروئے کار لانے کے لئے سرگرم ہو تو وہ
زیادہ بہتر طور پر اس چیز کو پالے جس کو وہ دوسروں سے مانگ کر پانا چاہتا ہے

آدمی اگر جہنم کے شعلوں کو دیکھ لے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر جنت کے باغوں کو دیکھ سکتا ہے

جب عقل چھین لی جائے

کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک بار دعا کی کہ "خدایا! میری قوم سے سب کچھ چھیننا مگر عقل نہ چھیننا"

اللہ تعالیٰ نے جواب دیا "اے موسیٰ! جب ہم کسی سے چھیننے والے ہوتے ہیں تو اس کی عقل ہی تو سب سے پہلے چھینتے ہیں"۔

اللہ کا یہ فیصلہ جب کسی قوم پر نافذ ہوتا ہے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی تمام کارروائیوں پر بے عقلی چھا جاتی ہے۔ اس کا ہر فرد اس طرح بولتا ہے جیسے اس کو یہ ابتدائی اصول بھی معلوم نہ ہو کہ آدمی کو چاہئے کہ بولے تو بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے۔ اس کے مقررین ایسی تقریریں کرتے ہیں جیسے انھیں خبر ہی نہ ہو کہ تقریر کا مطلب ہے بامعنی کلام سنانا نہ کہ کچھ الفاظ فضا میں بکھیرنا۔ اس کے عمل کرنے والے اس طرح عمل کرنے لگتے ہیں جیسے ان کو پتہ ہی نہ ہو کہ عمل کا مطلب ہے کوئی نتیجہ خیز کام کرنا نہ کہ محض لاحاصل اکھیڑ پچھاڑ کرنا۔ اس کے لیڈر ایسی سیاستیں چلاتے ہیں جیسے وہ جانتے ہی نہ ہوں کہ سیاست ایسی کوشش کا نام ہے جو سماج میں اصلاح لائے نہ کہ فساد اور بگاڑ پیدا کرے۔ اس کے اہل قلم ایسی تحریریں لکھتے اور چھاپتے ہیں جیسے ان کو اس بات کا شعور ہی نہ ہو کہ ایک قابل مطالعہ چیز پیش کرنے کا نام لکھنا ہے نہ کہ کچھ سطریں تیار کرکے چھاپ دینا۔ وہ اپنے حقوق کے لئے ایسی مطالباتی مہمیں چلاتے ہیں جیسے وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر ہوں کہ عمل سے استحقاق پیدا ہوتا ہے نہ کہ گدھے کی طرح چیخنے چلانے سے ـــــ ایسے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر اپنے مشاہدہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے انھوں نے نہیں دیکھا۔ وہ اپنے کانوں سے سنتے ہیں مگر سنی ہوئی بات کو اس طرح دہراتے ہیں جیسے انھوں نے نہیں سنا۔ وہ پڑھتے ہیں مگر پڑھی ہوئی چیز پر اپنا ردعمل اس طرح ظاہر کرتے ہیں جیسے انھوں نے نہیں پڑھا۔ حتیٰ کہ ان کا حال جانوروں کا سا ہو جاتا ہے کہ جو بظاہر آنکھ اور کان اور دل رکھتے ہیں۔ مگر ان کو کسی بات کی خبر نہیں ہوتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے:

لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم آذان لا يسمعون بها اولئك كالانعام بل هم اضل اولئك هم الغفلون (اعراف ۱۷۹)

ان کے دل ہیں جن سے وہ نہیں سمجھتے۔ ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ نہیں دیکھتے۔ ان کے کان ہیں جن سے وہ نہیں سنتے۔ وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ یہ غافل لوگ ہیں۔

جب کوئی قوم اس سطح پر پہنچ جائے تو کوئی دلیل اس کو دلیل نظر نہیں آتی۔ دلیل کا وزن آدمی اپنی عقل سے سمجھتا ہے اور عقل کو کھو کر وہ پہلے ہی اس سے محروم ہو چکا ہے۔ کھلے کھلے دلائل کے مقابلہ میں وہ ایسے الفاظ کا سہارا پالے گا جو اس کے اپنے ذہن سے باہر اپنی کوئی قیمت نہ رکھتے ہوں۔ اس کے منصوبوں کا غلط ہونا تجربات سے بالکل ثابت ہو رہا ہوگا مگر بدترین ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد وہ اسی ناقص منصوبہ کو ازسرنو دہرانے کے لئے کھڑا ہو جائے گا۔ کوئی معقول بات اس کی سمجھ میں نہ آئے گی۔ کیوں کہ کسی بات کی معقولیت کو سمجھنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔ البتہ غیر معقول بات کو وہ خوب سمجھے گا کیوں کہ اس کو سمجھنے کے لئے بے عقلی کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ ■

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جا است

قرآن کو خالی الذہن ہو کر پڑھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کی دعوت کا اصل نکتہ آخرت ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو بے شمار اسلامی تحریکیں اٹھیں، ان میں سے کسی تحریک نے بھی "انذار آخرت" کو اپنی دعوت کا بنیادی نکتہ نہیں بنایا۔ روایتی طور پر بلاشبہ ہر تحریک میں آخرت کا لفظ شامل رہا۔ مگر ایسا کسی تحریک میں نظر نہیں آتا کہ اس نے آخرت کے انتباہ کو اپنا نصب العین قرار دیا ہو اور یہی فکر اس کی تمام سرگرمیوں پر چھایا ہوا ہو۔ ۱۹۶۰ میں ایک بڑی اسلامی جماعت کا سالانہ اجتماع ہوا۔ اس موقع پر جماعت کے ذمہ دار اعلیٰ نے جو صدارتی تقریر کی، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے راقم الحروف نے لکھا تھا:

ایک جلسۂ عام کے موقع پر اسلامی تحریک کا تعارف کرنے کے لئے آپ خطبہ صدارت تیار کرتے ہیں جس میں شروع میں بتایا جاتا ہے کہ دعوت اسلامی کے تین نکات ہیں ـــــ خدا، آخرت، رسالت۔ مگر اس کے بعد "دنیا میں جو کچھ بگاڑ پایا جاتا ہے اس کا حقیقی سبب ان بنیادی باتوں سے انحراف ہے" کے فقرہ سے جو گریز شروع ہوتا ہے تو چالیس صفحات کا پورا خطبہ مسائل ملکی کی نذر ہو جاتا ہے اور کہیں بھی یہ بتانے کی نوبت نہیں آتی کہ مرنے کے بعد بھی تمہارا کوئی مسئلہ ہے جس سے تمہیں ڈرنا چاہئے۔ البتہ تقریر ختم ہونے لگتی ہے تو پھر روایتی ذہن مجبور کرتا ہے کہ اس قسم کا ایک فقرہ رکھ دیا جائے ـــ "مومن کا اول و آخر مقصد رضائے الٰہی اور فوز آخرت ہے" آپ کے اس طویل لفظی مجموعہ پر بے شک میں کوئی منطقی اعتراض نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اس میں دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیوں کو اسلام کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مگر پوری تقریر پڑھ کر ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ داعی کس بات سے لوگوں کو ڈرانا چاہتا ہے اور اس کے اوپر کیا چیز سوار ہے۔ ملک کے لسانی جھگڑے اور معاشی قضیے اس کو نظر آتے ہیں۔ یا وہ دیکھ رہا ہے کہ اسرافیل صور لئے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کس وقت حکم ہو اور پھونک مار کر دنیا کو تہ و بالا کر دیں۔ (تعبیر کی غلطی، مطبوعہ ۱۹۶۳، صفحہ ۳۲)

اسی کمی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلامی تحریکوں کی کثرت کے باوجود وہ افراد نہیں پیدا ہو رہے ہیں جو اسلام کا اصل مقصود ہیں۔ آج اسلام کے جھنڈے ہر طرف لہرا رہے ہیں، لاؤڈ اسپیکر پر اسلامی الفاظ کا غلغلہ بلند ہے۔ اسلام کے نام پر سارے عالم میں آمد و رفت کا طوفان جاری ہے اسلامی جلسوں اور اسلامی کانفرنسوں کے شور سے زمین کی فضائیں معمور ہو رہی ہیں۔ پھر بھی مسلمان مغلوب ہیں۔ اس کے باوجود اسلام کا احیا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔

اس کی وجہ صرف ایک ہے، اسلام کا غلبہ اسلام کے الفاظ بولنے سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اللہ سے ڈرنے والے لوگ پیدا ہو جائیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کا تمام ہنگاموں کے باوجود کہیں پتہ نہیں۔ خدا کی بھری ہوئی زمین میں وہ انسان کہیں دکھائی نہیں دیتا جو خدا کے خوف سے کانپتا ہو، خدا کے تصور سے جس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوں جس نے خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے کو پست کر رکھا ہو۔ قیامت کے اندیشہ نے جس کی نیند اڑا رکھی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے لوگ ظاہری زندگی کی سطح پر تیر رہے ہیں۔ آخرت کی سطح پر جینے والے اتنے نایاب ہیں کہ شاید اب ان کا کہیں وجود ہی نہیں۔ مکان کے چرچے ہوں مگر اینٹ موجود نہ ہو تو مکان کس طرح بن جائے گا (۱۰ مارچ ۱۹۷۹) ■

غیر اسلام کو اسلام کے نام پر کرنا

عباسی دور میں جب عقلی علوم مسلمانوں میں پھیلے تو ایک طبقہ اس کا سخت مخالف ہوگیا۔ اس زمانہ میں یہ فقرہ ضرب المثل بن گیا تھا: من تمنطق فقد تزندق (جس نے منطق سیکھی وہ زندیق ہوگیا) اسی طرح انیسویں صدی میں جب مغرب کے علوم اسلامی ملکوں میں داخل ہوئے اور لوگوں نے اس سے دلچسپی لینا شروع کیا تو ایک ازہری شاعر نے کہا:

ومن یقل بالطبع او بالعلة فذاک کفر عند اهل الملة

سید جمال الدین افغانی ۱۸۷۱ میں مصر آئے تو ازہر کے بہت سے طلبہ ان کے پاس آنے لگے۔ ان کے غیر روایتی انداز سے طلبہ بہت متاثر ہوتے تھے۔ انھیں میں سے ایک محمد عبدہ تھے جو اس زمانہ میں ازہر کے طالب علم تھے وہ جمال الدین افغانی سے اس درجہ قریب ہوئے کہ کہا جاتا ہے کہ جس طرح افلاطون کے بغیر سقراط کا علم ناپید ہوجاتا کیونکہ اس نے اپنی کوئی کتاب نہیں چھوڑی تھی۔ اسی طرح مفتی محمد عبدہ کے بغیر جمال الدین افغانی بھی گم نام ہوجاتے۔ کیونکہ انھوں نے بھی اپنے افکار کو کتاب کی شکل میں مرتب نہیں کیا۔ یہ کام ان کے بعد مفتی محمد عبدہ نے کیا۔

محمد عبدہ جب ازہر میں طالب کی حیثیت سے تھے اور جمال الدین افغانی کے پاس آتے جاتے تھے تو ازہر میں ان کے استادوں نے ان کو بدعقیدہ قرار دے دیا۔ حتیٰ کہ طلبہ میں سے کسی نے ایک روز ایک شیخ کے پاس خبر پہنچائی کہ محمد عبدہ وضو کے بغیر عصر کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ ان کے بارے میں بدگمانی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ استاد موصوف نے یقین کرلیا اور طلبہ کی ایک جماعت بھیجی کہ جاؤ ان کو پکڑ لاؤ۔ یہ لوگ پہنچے تو محمد عبدہ نماز کے لئے نیت باندھے کھڑے تھے۔ ان لڑکوں نے ان کو نماز کی حالت ہی میں پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے شیخ کے پاس لائے۔ شیخ نے ان کی تعزیر کا حکم دیا اور لڑکوں نے مل کر انھیں مارا۔

جمال الدین الافغانی، از محمود ابوریہ، صفحہ ۶

مومن جنت کا ایک پھول ہے

ایمان یہ ہے کہ آدمی اتنا بے نفس ہوجائے کہ دوسروں کی طرف سے جب اس کے دل پر چوٹ لگے تو وہ اس کو برداشت کرسکے۔ اس کو اپنے ناقص ہونے کا اتنا زیادہ احساس ہو کہ دوسروں کی طرف سے کی جانے والی تنقید کو وہ برا نہ مانے، دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی بے عزتی کو وہ نظر انداز کردے۔ اس کا دل اتنا صاف ہوجائے کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں پر ان کو معاف کرسکے ان کی باتوں کو بھلا دیا کرے، ان کے لئے اس کے دل سے دعائیں نکلتی ہوں۔ اسی کیفیت کا نام قرآن کی زبان میں قلب سلیم (شعراء ۸۹) ہے۔ جنت کی دنیا کے شہری وہی لوگ بنیں گے جو قلب سلیم کے مالک ہوں۔ جو اپنے آپ کو منفی جذبات اور ردعمل کی نفسیات سے اوپر نہ اٹھا سکیں، وہ گویا "کانٹوں" کی سطح پر جی رہے ہیں۔ ایسے لوگ "پھولوں" کے ہم نشین کس طرح بن سکتے ہیں۔ ■

● جدید انسان کا المیہ

سالزنتسین (Alexander Solzhenitsyn) ایک روسی ناول نگار ہے۔ اپنے تنقیدی ذہن کی وجہ سے اس کو روس سے نکال دیا گیا۔ ۱۹۷۴ میں وہ سوئٹزرلینڈ پہنچا اور وہاں سے امریکہ آیا۔ اس وقت سے وہ امریکہ کے شمال مشرقی علاقہ میں مقیم ہے۔

جون ۱۹۷۸ میں سالزنتسین کا ایک لیکچر ہارورڈ یونیورسٹی میں ہوا۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ روسی انسان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک قسم کی روحانی گھٹن (Suffocation of Spiritual Life) میں مبتلا ہے۔

● موسیقی کی اذیت

حال میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے:
"جدید موسیقی کی اذیت"

Henry Pleasants,
The agony of Modern Music

اس میں دکھایا گیا ہے کہ عام تصور کے برعکس، موسیقی انسان کے لئے نفسیاتی اور حیاتیاتی طور پر اذیت بخش زیادہ ہے اور مسرت بخش کم۔

● ۲۹واں دن

لسٹر براؤن (Lester R. Brown) کی ایک کتاب حال میں چھپی ہے جس کا نام ہے:

The Twenty Ninth Day

(۲۹واں دن) کتاب کا یہ نام ایک فرانسیسی پہیلی سے لیا گیا ہے۔ ایک حوض ہے جس میں سوسن (Lily) کے درخت ہیں۔ پہلے دن اس سوسن میں صرف ایک پتی ہے۔ دوسرے دن دو ہو جاتی ہیں۔ تیسرے دن چار، چوتھے دن آٹھ۔ "اگر حوض ۳۰ ویں دن بھر جاتا ہے" پہیلی کہتی ہے "تو کب وہ آدھا بھرے گا؟" جواب یہ ہے کہ "۲۹ ویں دن" گویا نصف حوض بھرنے میں تو ۲۹ دن لگیں گے مگر اس کے بعد پورا حوض صرف ایک دن میں بھر جائے گا۔ پچھلا سفر ۲۹ دن میں طے ہوا، اگلا سفر صرف ایک دن میں طے ہو جائے گا۔

مشہور امریکی ماہر اقتصادیات لسٹر براؤن کے نزدیک یہی ہماری زمین کی صورت حال ہے۔ ہماری زمین جس پر اس وقت تقریباً چار ارب انسان بستے ہیں، اپنے ۲۹ویں دن میں ہے۔

● تہذیب کے بعد ریگستان

مالتھس (۱۸۳۴—۱۷۶۶) نے کہا تھا کہ خوراک کے ذخیرے جس نسبت سے بڑھتے ہیں، آبادی میں اس سے دگنا رفتار سے اضافہ ہوتا ہے۔ مگر وہ یہ بتانے میں ناکام رہا کہ تہذیب انسانی کی ترقی اکثر اوقات پیداواری امکانات کو برباد کر دیتی ہے۔ مشرق اوسط جو انسان کا قدیم ترین مسکن رہا ہے۔ پچھلے ادوار میں وہاں بڑے بڑے جنگل تھے۔ اب یہ علاقہ بڑی حد تک بے درخت اور ریگستان ہو چکا ہے۔ ایک فرانسیسی مفکر نے کہا ہے:

THE FORESTS COME BEFORE CIVILIZATION, THE DESERTS AFTER THEM.
The Times of India, 28-5-1978

تہذیب سے پہلے جنگلات ہوتے ہیں اور تہذیب کے بعد ریگستان۔

● ہندستان کا حصہ

خلیج عرب کے ممالک کی کل آبادی ۱۲۰ لاکھ ہے۔ اس میں روزگار کے لئے جانے والے ہندستانیوں کی تعداد ۱/۲۵ فی صد ہے۔ اس وقت ہندستان کو عرب ملکوں سے غیر ملکی کرنسی کی صورت میں جو رقم حاصل ہو رہی ہے اس کی مقدار سالانہ ۱۵۰۰ کرور روپے ہے۔ دولت حاصل کرنے کے لیے لوگ پہلے "ولایت" جایا کرتے تھے، اب انکی منزل عرب بن رہا ہے۔

وہ لوگ جو آخرت کے باغوں میں جگہ پائیں گے

آدمی کو چاہئے کہ خدا سے اتنا قریب ہو جائے کہ ہر وقت اس کو خدا کی یاد آتی رہے۔ اللہ کی بڑائی کا احساس اس کے اوپر اتنا چھا جائے کہ اپنا وجود اس کو بے حقیقت نظر آنے لگے۔ جنت اور جہنم کا اس کو اتنا یقین ہو جائے کہ دنیا کے آرام و تکلیف سے زیادہ اس کو آخرت کے آرام و تکلیف کی فکر رہنے لگے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھائے کہ اپنی غلطیاں اس کو اس طرح دکھائی دینے لگیں جس طرح کسی کو اپنے دشمن کی غلطیاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نفسیاتی گرہوں سے اتنا آزاد کرے کہ اختلاف اور شکایت کے باوجود دوسرے کے لئے اس کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں۔ حق کا اعتراف نہ کرنا اس کو ایسا معلوم ہو گویا وہ اپنے آپ کو قتل کر رہا ہے۔ دوسرے کا آشیانہ اجاڑنا اس کو ایسا لگے جیسے وہ خود اپنے آشیانہ میں آگ لگا رہا ہے۔ یہی خدا پرستی کی زندگی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کو خدا اپنی جنتوں میں جگہ دے گا۔

جو لوگ اللہ کے سچے بندے بن جائیں، ان کے لئے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ دنیا میں انھیں غالب کرے گا۔ یہ غلبہ ان کی خدا پرستی کا اصل انعام نہیں بلکہ اصل انعام کی ایک ابتدائی علامت ہے۔ خدا پرستوں کے لئے اللہ نے جو انعام مقدر کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کے بعد آنے والی دنیا میں وہ ان کو غلبہ و سربلندی عطا کرے۔ ان کو ہر قسم کے خوف اور حزن سے پاک کر کے اپنی رحمتیں اور نعمتیں دائمی طور پر ان کی وراثت میں دے دے۔ اسی کا نام جنت والی زندگی ہے جو آخرت میں مومنین صالحین کو حاصل ہوگی۔ مگر جب اہل ایمان کا کوئی قابل لحاظ گروہ بن جاتا ہے تو اللہ اس دنیا میں بھی اس کو علامتی طور پر غالب کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں سرکش اور غافل انسانوں کو مغلوب کر کے دکھایا جاتا ہے کہ آخرت کی ابدی دنیا میں کون عزت اور برتری کے مقام پر ہوگا اور کون ذلت اور پستی کے گڑھے میں ڈال دیا جائے گا

یہ وقت کا سوال ہے نہ کہ قیمت کا

آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۱۶۳ء میں قائم ہوئی۔ اس کے ہرے ہرے لان ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ ایک امریکن کروڑ پتی نے اس کے لان دیکھے تو وہ ان کو بہت پسند آ گئے۔ انھوں نے چاہا کہ ایسا ہی لان ان کی کوٹھی میں بھی ہو۔

"ایسا لان کتنے ڈالر میں تیار ہو جائے گا"، انھوں نے آکسفورڈ کے مالی سے پوچھا۔

"مفت میں" مالی نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا

"وہ کیسے"

"اس طرح کہ آپ اپنی زمین کو ہموار کر کے اس پر گھاس جما دیجئے۔ جب گھاس بڑھے تو اس کو کاٹ کر اوپر سے رولر پھیر دیجئے۔ اسی طرح پانچ سو برس تک کرتے رہئے۔ جب پانچ سو سال پورے ہوں گے تو ایسا ہی لان آپ کے یہاں تیار ہو جائے گا۔ یہ وقت کا سوال ہے نہ کہ قیمت کا۔" ■

قانونِ فطرت اور قانونِ شریعت

زندگی کے معاملات کا بننا اور بگڑنا، ایک لفظ میں، منہاج السنہ پر منحصر ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے کہا:

عَجِبتُ لِقومٍ عَرَفوا الاسنادَ وصِحّتَہ یَذْھَبُونَ الی رأیِ سفیان۔ واللہ تعالیٰ یقول: فَلْیَحذَرِ الذین یُخالفون عن أمرہ ان تُصیبَھم فتنۃٌ او یُصیبَھم عذابٌ الیم (نور ۶۳)

مجھ کو ان لوگوں پر تعجب ہے جو حدیث کی سند اور صحت معلوم کرنے کے بعد سفیان ثوری کی رائے کو اختیار کرتے ہیں۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: پس چاہئے کہ ڈریں وہ لوگ جو خلاف کرتے ہیں اس کے امر کے کہ پڑے ان پر کچھ خرابی یا پہنچے ان کو دردناک عذاب۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر جو شریعت نازل فرمائی اور رسولؐ نے جس کو اپنی زندگی میں برت کر اس کا کامل نمونہ پیش فرمایا، اس کو اس آیت میں امر رسول کہا گیا ہے۔ اس امر رسول کو اختیار کرنے میں انسان کی دنیا و آخرت کا بناؤ ہے اور اس امر رسول سے انحراف میں انسان کی دنیا و آخرت کا بگاڑ۔ یہ امر رسول یا سنت رسول انسانی زندگی کے لئے وہی اہمیت رکھتا ہے جو مادی دنیا کے لئے قانون فطرت۔ ہم ایک باغ کے مالک بننا چاہیں تو ہم قانون فطرت کی پیروی کر کے ہی باغ کے مالک بن سکتے ہیں۔ مثلاً ہم کو یہ کرنا پڑے گا کہ ہم بیج کو زمین میں دفن کریں۔ اگر ہم بیج کو فضا میں اچھالیں یا شاخوں کو زمین میں گاڑیں تو ہم اپنے لئے ایک ہرا بھرا باغ نہیں پا سکتے۔ ہم کو بہر حال یہ کرنا ہوگا کہ ہم بیج کو زمین میں گاڑیں اور فطرت کے مقررہ قانون کے مطابق اس کی پرورش کریں۔ اس کے بعد ہی ہم اپنے لئے ایک ہرا بھرا باغ دیکھ سکتے ہیں۔ ٹھیک یہی معاملہ قانون شریعت کا بھی ہے۔ جس طرح مادی کائنات کے لئے ایک دینُ اللہ ہے، اسی طرح انسانی زندگی کے لئے بھی ایک دینُ اللہ (آل عمران ۸۳) ہے۔ اللہ نے جس طرح مادی دنیا کے لئے ایک قانون مقرر کیا ہے، اسی طرح اس نے انسانی دنیا کے لئے بھی ایک قانون (رعد ۲) مقرر کیا ہے۔ جمادات و نباتات کی دنیا کے معاملات ہوں یا انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے معاملات، دونوں جگہ کوئی حقیقی نتیجہ خدا کے مقررہ راستہ کو اختیار کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

فطرت کے نظام میں تبدیلی صرف مسائل پیدا کرتی ہے

امریکہ سے ایک ناول چھپا ہے جس کا نام ہے "اکیلی خاتون"

Harold Robbins, The Lonely Lady
New English Library, London, 1976, pp. 448

اس ناول میں امریکہ کے ترقی یافتہ معاشرہ کی ایک کمزوری کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ عورت کی غیر شادی شدہ زندگی بالآخر ایک ناقابل برداشت تنہائی پر ختم ہوتی ہے۔ کہانی کے مطابق، ایک خوبصورت اور نوجوان امریکی خاتون فلمی دنیا کی چمک دمک (Glamour) سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ شادی شدہ زندگی کو چھوڑ کر فلم ایکٹرس بن جاتی ہے۔ اس کی باکمال نسوانیت

اس کی مدد کرتی ہے۔ وہ بہت جلد ترقی کی سیڑھیاں طے کرنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ترقی کے آسمان پر پہنچ جاتی ہے۔ دولت، شہرت، عزت اور چاہنے والوں کی بھیڑ، ہر چیز بافراط اس کے گرد جمع ہوجاتی ہے۔ مگر ترقی کی آخری انتہا پر پہنچنا اس کو سکون نہیں دیتا۔ اب وہ ایک تلخ حقیقت (Bitter Truth) کو دریافت کرتی ہے:

That fame has a way of fading, and friends a way of disappearing when they are most needed.

یہ کہ شہرت بالآخر ختم ہوجاتی ہے۔ اور دوست بالآخر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں جب کہ ایک عورت کو ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ امریکی خاتون نہایت حسرت بھرے انداز میں کہتی ہے:

Only a woman knows what loneliness is

حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت ہی اس بات کو جانتی ہے کہ اکیلا پن کیا ہے۔ ناول کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت اکیلی نہیں رہ سکتی۔ فلمی دنیا کے ذریعہ بڑی بڑی کمائی کرنا اور اپنے لئے ایک خود مختار زندگی حاصل کرنا بظاہر بڑا پرکشش معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب عورت کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ جب اس کے ساتھیوں میں اس کے لئے کشش باقی نہیں رہتی تو وہ ایک ناقابل برداشت حادثہ سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کے پاس دولت اور مادی ساز و سامان کا انبار ہوتا ہے۔ مگر وہی چیز نہیں ہوتی جس کی ایک عورت کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یعنی زندگی کا چین۔ اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے مگر وہ انسان نہیں ہوتا جو اس کے صبح و شام میں اس کا ساتھی بن سکے۔ وہ ایک ایسے آباد گھر کی مالک نہیں ہوتی جس کو وہ اپنا گھر سمجھے:

Here is a loneliness born of independence, of honest individualism in a society where only dishonesty brings profit.

یہ ایک تنہائی ہے جو خود مختار زندگی سے برآمد ہوتی ہے، ایک دیانت دارانہ فردیت، ایک ایسے سماج میں جہاں بددیانتی ہی سب سے بڑا نفع بخش سرمایہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا نظام بے حد نازک ترکیب کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ اس میں ادنیٰ تبدیلی بھی صرف بربادی پر ختم ہوتی ہے۔ جمادات اور نباتات کی دنیا کے لئے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کامیابی کا راز یہ ہے کہ فطرت کے بنائے ہوئے نظام سے انحراف نہ کیا جائے۔ یہاں مطلوب نتیجہ تک پہنچنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ فطرت کے مقررہ ڈھانچہ کو قبول کیا جائے۔ مگر وہی انسان جو جمادات اور نباتات کے معاملہ میں اس حقیقت کی مکمل پابندی کرتا ہے وہ خود اپنی زندگی کے معاملہ میں اس ابدی حقیقت کو بھول جاتا ہے۔ عورت اور مرد کے لئے فطرت کا بنایا ہوا نظام یہ ہے کہ وہ شادی شدہ زندگی گزاریں۔ ان کی جسمانی ساخت، ان کے نفسیاتی اور خاندانی مسائل، ان کے اجتماعی رشتے سب اپنی درستگی کے لئے شادی شدہ زندگی کا تقاضا کرتے ہیں۔ عورت کا آزاد اور خود مختار ہونا، الفاظ کے اعتبار سے بظاہر بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کا عملی تجربہ انتہائی بھیانک ہے۔ عورت اپنی جوانی کی عمر میں بڑی آسانی سے اس قسم کے نظریات کا شکار ہوجاتی ہے۔ مگر جب اس کی عمر زیادہ ہوتی ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا راستہ غلط تھا۔ مگر یہ علم اس کو صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ تلافی کا وقت نہیں ہوتا۔ اب اس کے لئے موجودہ دنیا میں جو چیز رہ جاتی ہے وہ صرف یہ کہ کتوں اور خرگوشوں کو پال کر مصنوعی طور پر ان سے دل بہلائے اور بالآخر حسرت اور مایوسی کے قبرستان میں جاکر سو رہے۔

زندگی بعد موت کا علمی ثبوت

انسبرک (آسٹریا) میں اکتوبر ۱۹۷۸ کے پہلے ہفتہ میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں مغربی یورپ اور شمالی امریکہ کے ایک ہزار سائنس داں اور علماء مذاہب شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کا مقصد اس سوال پر غور کرنا تھا کہ کیا موت کے بعد زندگی ہے۔ جن لوگوں نے اس موضوع پر تحقیقات کی ہیں، انھوں نے اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کئے۔ کانفرنس کی اکثریت کا رجحان یہ تھا کہ موت کے بعد بھی زندگی کا تسلسل باقی رہتا ہے۔ تاہم کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں جو دلائل دئے جاتے ہیں وہ متعلقہ دعوے کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہیں۔ ایک ہفتہ تک بحث جاری رہی۔ آخر میں کانفرنس نے جو رزولیوشن پاس کیا، اس میں حسب ذیل الفاظ میں زندگی بعد موت کا اقرار کیا گیا ہے:

There is enough evidance now available to suggest that we cannot rule out an after-life.

The Times of India, 9-10 Oct.,1978

زندگی بعد موت کے حق میں اب اتنے کافی شواہد جمع ہو چکے ہیں کہ ہم اس کو خارج از امکان نہیں قرار دے سکتے۔

اس سلسلے میں ایک اہم کتاب رومیو ارر کے نام سے شائع ہوئی ہے:

Dr. Lyall Watson, The Romeo Error

اس کتاب میں مصنف نے کثیر تعداد میں ایسے لوگوں کے واقعات جمع کئے ہیں جن کو ڈاکٹروں نے "مردہ" قرار دے دیا تھا، پھر وہ "زندہ" ہو گئے۔ انھوں نے اپنی "موت" کے تجربات بتائے۔ یہ واقعات مختلف الگ الگ ملکوں سے جمع کئے گئے ہیں۔ مگر ان میں حیرت انگیز یکسانیت ہے۔ مثلاً "موت" کے بعد اپنے مردہ جسم سے الگ اپنے وجود کا احساس۔ ایک تیز روشنی کا دیکھنا۔ اپنے مردہ عزیزوں سے ملاقات، وغیرہ۔ اس یکسانیت کی وجہ سے علماء یہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ضرور ان میں کوئی صداقت ہے۔

کانفرنس میں جو مقالات پیش کئے گئے ان میں ایک اہم مقالہ ڈاکٹر کارلوز اوسس (Carlos Osis) کا تھا۔ انھوں نے ایک ہزار ایسے واقعات کا تجزیہ کیا جن میں مرنے والے لوگوں کے آخری لمحات کا ریکارڈ جمع کیا گیا ہے۔ یہ واقعات امریکہ اور ہندوستان کے لوگوں کے تھے۔ ماحول اور جغرافیہ کے غیر معمولی فرق کے باوجود مرنے والوں کے تاثرات انتہائی یکساں تھے۔ مثلاً ہر ایک کو آخر وقت میں ایسے الفاظ سنائی دیئے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک اور دنیا میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں جہاں ان کے مرے ہوئے اعزہ پہلے سے موجود ہیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جب موت کے بالکل قریب پہنچتا ہے تو اس کے اوپر سے غیب کے پردے ہٹنے لگتے ہیں۔ وہ دوسرے عالم کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے جو کلمات نکلتے ہیں وہ گویا ایک ایسے شخص کے کلمات ہوتے ہیں جو اپنے سفر حیات کو مکمل کر کے اگلی دنیا کے دروازے پر کھڑا ہو گیا ہو۔ سورہ واقعہ کے اس بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ جب جان حلق تک آجاتی ہے تو "ہم مرنے والے کے پاس ہوتے ہیں مگر تم نہیں دیکھتے" ۸۵ ■

وہ مواقع جو استعمال نہ ہو سکے

فریڈرک ٹوکر (۱۹۲۹-۱۸۵۲) ایک انگریز آئی سی ایس تھا۔ وہ کمشنر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا کہ اس کے اندر مذہبی اور روحانی جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے ۱۸۸۱ء میں سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔ انگلستان میں اس وقت جنرل ولیم بوتھ کے تحت سالویشن آرمی (نجات دہندہ فوج) کی تحریک چل رہی تھی۔ اس نے جنرل بوتھ کو آمادہ کیا کہ اس تحریک کی ایک شاخ ہندستان میں قائم کی جائے۔ چنانچہ ۱۹ ستمبر ۱۸۸۲ کو اس کی پہلی شاخ بمبئی میں قائم ہوئی۔

فریڈرک ٹوکر (Frederick Tucker) نے اپنا نام فقیر سنگھ رکھ لیا۔ وہ پنجاب کے دیہاتوں میں ننگے پاؤں گھومتا اور لوگوں کو روزگار پر لگانے کی کوشش کرتا۔ اس نے دیہی بنک قائم کئے۔ گھریلو صنعتیں رائج کیں اور کالونیاں بنائیں، وغیرہ (ٹائمس آف انڈیا ۱۱ مارچ ۱۹۷۹)

"استعمار" کے زمانہ میں اس طرح کے بہت سے انگریز تھے جن کی فطرت زندہ تھی اور جن کے اندر دین حق کا بیج ڈالا جاسکتا تھا۔ مگر تمام قائدین سیاسی ہنگاموں میں لگے رہے۔ خدا کے پیغام کو خدا کے بندوں تک پہنچانے کی ضرورت کسی کو محسوس نہ ہوئی۔ اس قسم کے لوگ اگر آخرت میں کہیں کہ خدایا ہم حق کی تلاش میں تھے۔ مگر حق کے امانت داروں نے ہم کو حق سے آشنا نہیں کیا۔ وہ تو ہم سے صرف سیاسی لڑائی لڑتے رہے تو مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے قائدین کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔

یہ ان مواقع کی ایک مثال تھی جو انفرادی اعتبار سے ہمارے لئے پیدا ہوئے۔ حالیہ زمانے میں اسی قسم کے مواقع اجتماعی سطح پر بھی باربار سامنے آئے۔ مگر مسلمان ان سے کوئی دعوتی فائدہ حاصل نہ کر سکے

خاندان ہیپس برگ (Hapsburgs) ایک زمانہ میں آسٹریا و ہنگری پر حکومت کرتا تھا۔ ترکی کے سلطان سلیمان اعظم (۱۵۶۶-۱۵۲۰) کے زمانہ میں اس کے تخت پر شہنشاہ چارلس پنجم (Charles V) حکمراں تھا۔ اس وقت وہ یورپ کا سب سے بڑا فرماں روا تسلیم کیا جاتا تھا۔ یورپ کے نصف سے زیادہ حصہ پر اس کی سلطنت پھیل چکی تھی۔ اس حکومت کے تعلقات فرانس سے اچھے نہ تھے۔ فرانس کی یہ کوشش تھی کہ اس وسیع سلطنت کو مغرب کی سمت بڑھنے سے روکے۔ اسی طرح مشرق میں عثمانی سلطنت ہیپس برگ حکمرانوں کے لئے سد راہ بنی ہوئی تھی۔ فرانس نے محسوس کیا کہ وہ اور سلطنت عثمانیہ دونوں ہیپس برگ کے مشترک حریف ہیں۔ اس نے اپنے محاذ کو مضبوط کرنے کے لئے سلطنت عثمانیہ سے تعلقات بڑھانا چاہا۔ چنانچہ فرانس کی حکومت نے ۱۵۳۴ میں اپنے سفیر کو قسطنطنیہ بھیج کر خود ہی اس کی طرف پہل کی۔ دونوں میں اچھے سیاسی تعلقات قائم ہوگئے۔ ایک سال بعد جب شاہ فرانسس (Francis I) اور شاہ چارلس پنجم میں جنگ چھڑی تو فرانس نے سلطان سلیمان سے مدد کی درخواست کی۔ سلطان سلیمان نے اس جنگ میں نہ صرف فرانس کی فوجی مدد کی بلکہ اس سے دوستی اور تجارت کا معاہدہ بھی کر لیا۔ اس معاہدہ کے مطابق فرانسیسیوں کو صرف پانچ فی صد محصول کے معاوضہ میں تمام ترکی بندرگاہوں سے تجارت کرنے کی اجازت ملی تھی۔ فرانسیسی تاجروں کے

دیوانی و فوجداری مقدمات ان کے اپنے قونصل کے سپرد کر دئے گئے۔ ان کو ترکی میں پوری مذہبی آزادی حاصل تھی اور ترکی میں واقع عیسائیوں کے مقامات مقدسہ کی نگرانی بھی ان کا حق تھا۔ اس دوستانہ معاہدہ کی وجہ سے فرانس اور ترکی کے تعلقات تقریباً تین صدیوں تک بہت خوش گوار رہے۔ ان تعلقات سے فرانس میں بہت بڑے پیمانہ پر تبلیغ کا فائدہ حاصل کیا جا سکتا۔ مگر اس سلسلہ میں کچھ بھی نہ کیا جا سکا۔

اسی طرح ترکی اور روس قدیم زمانہ میں ایک دوسرے کے روایتی حریف تھے۔ اگست ۱۹۱۴ میں جب یورپ کی عالم گیر جنگ چھڑی تو ایک طرف روس، برطانیہ اور فرانس تھے جن کو اتحادی طاقتیں (Allied Powers) کہا جاتا تھا۔ دوسری طرف جرمنی اور اٹلی وغیرہ تھے جن کو محوری طاقتیں (Axis Powers) کہا جاتا تھا۔ مصطفیٰ کمال اور بعض دوسرے لوگوں کی رائے تھی کہ ترکوں کو اس جنگ سے علیحدہ رہنا چاہئے۔ اس وقت ترکی کے اقتدار پر انور پاشا اور ان کے پرجوش ساتھیوں کا قبضہ تھا۔ انھوں نے روس اور برطانیہ کی دشمنی میں جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس جنگ میں ترکوں کی شرکت نے اتحادیوں کے لئے سخت دشواریاں پیدا کر دیں۔ ترکوں نے آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال کو دشمن کے جہازوں کے لئے بند کر دیا۔ اس کی وجہ سے برطانیہ اور فرانس کا تعلق روس سے منقطع ہوگیا۔ روس اس وقت ایک غیر صنعتی ملک تھا اس لئے جب تک برطانیہ اور فرانس کے کارخانوں سے اس کو کافی مقدار میں سامان جنگ فراہم نہ ہوتا رہے وہ جدید طرز کی جنگ کو کامیابی کے ساتھ جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ تاہم ترکی کے لئے یہ پالیسی بہت مہنگی پڑی۔ جنگ میں جرمنی کو شکست ہوئی اور اس کے بعد ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا قسطنطنیہ کے تخت پر اگرچہ برائے نام سلطان باقی رہا مگر عملاً ترکی کے تمام معاملات اتحادیوں کے قبضہ میں آگئے —— یہ سب کچھ ہوا۔ مگر جرمنی سے اتنے لمبے قریبی تعلق کے باوجود جرمنی میں تبلیغ اسلام کا کوئی کام نہ کیا جا سکا۔

اس قسم کے سیاسی اور اقتصادی اتحاد کی مثالیں مسلم حکومتوں کی تاریخ میں کثرت سے ملیں گی۔ مگر ایسی کوئی مثال نہیں جب کہ دعوت و تبلیغ کے مقصد کی خاطر کسی سے اتحاد کیا گیا ہو۔ یا سیاسی اتحاد کے ذریعہ پیدا شدہ حالات سے دعوتی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ اگر دعوتی مزاج ہوتا تو اس قسم کے اتحاد سے غیر معمولی دعوتی فائدے حاصل کئے جا سکتے تھے۔ اور مسلمانوں کی تاریخ اس سے بالکل مختلف ہوتی جو آج ہمیں نظر آتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں انسانوں کے باہمی تعلقات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ مگر تعلقات میں اضافہ کا یہ فائدہ حاصل نہ ہو سکا کہ مسلمان نئے مواقع کو دوسرے لوگوں تک دین کا پیغام پہنچانے میں استعمال کرتے۔ انفرادی روابط اور قومی تعلقات دونوں ہی اس قسم کا کوئی فائدہ حاصل کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ہمارے اسلاف کا یہ حال تھا کہ وہ ربط و تعلق کے ہر موقع کو دعوت کے لئے استعمال کرتے تھے۔ مگر آج مسلمانوں کے لئے دوسری قومیں صرف دو باتوں کا موضوع بن کر رہ گئی ہیں۔ معاشی فائدہ حاصل کرنا یا سیاسی جھگڑے کھڑے کرنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ہے نہ کہ حقوق طلبی اور قومی محاذ آرائی کا۔ مسلمان اپنی لڑائی جھگڑے کی سیاست سے دوسری قوموں کو اسلام سے متوحش کرنے کا کام تو بہت بڑے پیمانہ پر کر رہے ہیں مگر ان کو اسلام کے قریب لانے سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ■

جو اس لئے عمل کرتے ہیں کہ انھیں کہا جائے

ایک "ظالم" حکمراں کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے پُرشور جہاد شروع ہو تو بہت سے لوگ اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو حکومت کی گولیاں کھا کر جان دے دیتے ہیں۔ لیکن ایک معمولی آدمی جو ان مجاہدین میں سے کسی مجاہد کے ظلم کا شکار ہو رہا ہو اور وہ اس مجاہد سے مل کر کہے کہ میرے اوپر اپنا یہ ظلم ختم کردو تو مجاہد اسلام کو اس معاملہ سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "ظالم حکمراں" کو گدی سے ہٹانا ایک ایسا کام ہے جو اخبارات میں چھپتا ہے۔ اس میں لیڈری ملتی ہے۔ اس سے آدمی کا نام چمکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک انفرادی معاملہ کو نبٹانا اپنے اندر کوئی اخباری اہمیت نہیں رکھتا۔ مزید یہ کہ اس میں اپنے نفس کو دبانا ہے جو ہمیشہ انسان کے لئے مشکل ترین کام رہا ہے۔ اجتماعی خطاب میں الفاظ بولنا کافی ہو جاتا ہے جب کہ انفرادی شکایت کو دور کرنے میں عمل کے تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ پہلی صورت میں آدمی کی شان بڑھتی ہے، دوسری صورت میں اس کی شان گھٹتی ہے۔ پہلی صورت میں آدمی کا درجہ بلند ہوتا ہے اور دوسری صورت میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلہ میں نیچا کرنا پڑے گا۔

اسی طرح تقریر و تحریر کے اسٹیج پر دین کی علم برداری کرنی ہو تو بہت سے سورما جائیں گے جو اسلامی موضوعات پر الفاظ کے دریا بہا دیں۔ مگر اسلامی تعمیر کے لئے خاموش جدوجہد کرنا ہو تو اس میں اپنا حصہ ادا کرنے کا شوق کسی میں پیدا نہیں ہوگا۔ کسی شہر میں فساد ہو جائے تو رہنماؤں کا قافلہ امدادی چندہ جمع کرنے کے لئے نکل پڑے گا۔ لیکن اگر ایک مصیبت کا مارا آدمی ان کے پاس پہنچے اور ان سے اپنی امداد کے لئے کہے تو اس کی مدد کے لئے کوئی تڑپ ان کے اندر نہ پیدا ہوگی۔ مسلمانوں کی کسی آبادی پر آفت نازل ہو تو وہ اخباری بیان کے ذریعہ لوگوں سے "یوم دعا" منانے کی اپیل کریں گے۔ مگر ان کی اپنی ایک رات بھی ایسی نہ گزرے گی جب کہ ستم رسیدہ مسلمانوں کے غم میں ان کی نیند اڑ گئی ہو اور وہ رو رو کر اپنی تنہائیوں میں اللہ سے دعائیں مانگ رہے ہوں۔ وہ خود اپنا منصب یہ بتائیں گے کہ خدا نے ان کو احتساب کائنات کا کام سپرد کیا ہے لیکن اگر ان کی اپنی ذات میں کسی غلطی کی نشان دہی کیجئے تو بپھر اٹھیں گے اور چاہیں گے کہ ایسے گستاخ انسان کی جڑ کھود ڈالیں۔

کیوں ایسا ہے کہ پہلی قسم کے کام کا موقع ہو تو سارے رہنما اس کی طرف دوڑتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے قسم کے کام کے لئے ان کے اندر کوئی اکساہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ پہلے کام میں شہرت و عزت ملتی ہے۔ جب کہ دوسرے کام میں آدمی کو اس قسم کا کوئی دنیوی کریڈٹ نہیں ملتا۔ وہ اسلام سے یہ قیمت لینا چاہتے ہیں کہ ان کو "کہا جائے"۔ اس لئے جہاں کہے جانے کی امید ہو وہاں وہ لپکتے ہیں اور جہاں یہ امید نہ ہو اس سے بے رغبت ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ رہنماؤں میں جس اسلام کی دھوم ہے وہ اشتہاری اسلام ہے نہ کہ حقیقی اسلام۔ وہ دنیوی قیادت کا ایک بازار لگاتے ہیں اور اس کو مقدس ظاہر کرنے کے لئے اس کو اسلام کا نام دے دیتے ہیں۔ ان کو اس اسلام سے دلچسپی ہے جس میں اخباری اہمیت (نیوز ویلو) ہو جس سے ان کی قائدانہ امیج بنتی ہو، جس کے ذریعہ دنیا کا کوئی نفع حاصل ہوتا ہو۔ ان کو

اُس اسلام سے کوئی دل چسپی نہیں جس سے خدا خوش ہوتا ہو۔ جس سے آخرت کا انعام ملنے والا ہو۔ ایسے لوگوں کی ظاہری کامیابیاں اکثر انہیں دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔ مگر انہیں اس حدیث رسول کو نہ بھولنا چاہیے جس کو بیان کرتے ہوئے رسول اللہ کے صحابی بے ہوش ہو گئے تھے :

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان اول الناس یقضی یوم القیامۃ علیہ رجل اُستشھد فأتی بہ فعرفہ نعمتہ فعرفھا، قال: فما عملت فیھا؟ قال: قاتلت فیک حتی استشھدت، قال: کذبت و لکنک قاتلت لأن یقال جرِیٔ فقد قیل، ثم اُمربہ فسحب علیٰ وجھہ حتی القی فی النار، ورجل تعلم العلم وعلّمہ وقرأ القرآن، فأتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفھا، قال: فما عملت فیھا؟ قال: تعلمت العلم وعلمتہ، وقرأت فیک القرآن، قال: کذبت ولکنک تعلمت لیقال عالمٌ، وقرأت القرآن لیقال قاریٌ فقد قیل، ثم امربہ فسحب علی وجھہ حتی القی فی النار، ورجل وسع اللہ علیہ وأعطاہ من اصناف المال فأتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفھا، قال: فما عملت فیھا؟ قال: ماترکت من سبیل تحب ان ینفق فیھا الا أنفقت فیھا لک، قال: کذبت ولکنک فعلت لیقال ھو جوادٌ فقد قیل، ثم اُمربہ فسحب علی وجھہ ثم القی فی النار" (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا: قیامت کے دن سب سے پہلے جس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ وہ شخص ہے جو شہید ہوا۔ اس کو لایا جائے گا۔ اللہ اس کو اپنی نعمتیں بتائے گا۔ وہ ان کا اقرار کرے گا۔ اللہ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے ساتھ کیا عمل کیا۔ وہ کہے گا میں نے تیری راہ میں جنگ کی یہاں تک کہ میں شہید ہو گیا۔ اللہ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا۔ بلکہ تو نے اس لئے جنگ کی تاکہ کہا جائے کہ تو بہادر ہے۔ سو کہا جا چکا۔ پھر حکم ہوگا اور اس کو منھ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس شخص کو بلایا جائے گا جس نے علم دین سیکھا اور اس کی تعلیم دی اور قرآن کو پڑھا۔ اللہ اس کو اپنی نعمتیں بتائے گا وہ ان کا اقرار کرے گا۔ اللہ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے ساتھ کیا عمل کیا۔ وہ کہے گا میں نے علم دین سیکھا اور سکھایا اور تیری راہ میں قرآن پڑھا۔ اللہ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا۔ بلکہ تو نے علم اس لئے سیکھا تاکہ تو عالم کہا جائے اور قرآن اس لئے پڑھا تاکہ تجھ کو قرآن پڑھنے والا کہا جائے۔ سو کہا جا چکا۔ پھر حکم ہوگا اور اس کو منھ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس شخص کو بلایا جائے گا جس کو اللہ نے وسعت دی تھی اور مال عطا کیا تھا۔ اللہ اس کو اپنی نعمتیں بتائے گا۔ وہ ان کا اقرار کرے گا۔ اللہ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے ساتھ کیا عمل کیا۔ وہ کہے گا میں نے ان کو تیرے پسندیدہ راستوں میں خرچ کیا۔ اللہ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا۔ بلکہ تو نے اس لئے خرچ کیا کہ تجھ کو سخی کہا جائے۔ سو کہا جا چکا۔ پھر حکم ہوگا اور اس کو منھ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

یہ ان لوگوں کا حال ہے جنھوں نے دین کے نام پر جان دی، دین کی خدمت میں اپنی زندگیاں لگائیں۔ دین کے نام پر اپنے مال کو خرچ کیا۔ مگر یہ سب کچھ انھوں نے نمائش کے جذبہ کے تحت کیا۔ اس لئے وہ خدا کے یہاں غیر مقبول ٹھہرے اور جہنم میں داخل کر دیئے گئے۔ پھر ان لوگوں کا قیامت کے دن کیا حال ہوگا جنھوں نے دین کو تجارت بنایا جنھوں نے دین کے نام پر دنیا کمائی۔ جو دین کو دینے کے بجائے صرف دین سے لیتے رہے۔ ■

جب موت آدمی کے ذہنی طلسم کو توڑ دے گی

ایران میں فروری ۱۹۷۹ میں شاہ مخالف عناصر غالب آگئے۔ اس کے بعد خفیہ انقلابی عدالتیں قائم ہوئیں ۔ سرسری سماعت کے بعد ان افسروں کو گولی مار کر ہلاک کیا جانے لگا جنھوں نے شاہ کے حکم کی تعمیل میں شاہ مخالف عناصر کو کچلنے کی کوشش کی تھی۔ اس سلسلہ میں جو خبریں آرہی ہیں ان میں بڑی عبرت کا سامان ہے۔

جنرل ربیع شاہ کی خفیہ پولس ساواک (SAVAK) میں اعلیٰ افسر تھے۔ ۹ اپریل ۱۹۷۹ کو تہران میں ان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ایران کی نئی انقلابی حکومت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔ رائٹر کے مطابق انھوں نے اپنے بیان میں عدالت سے کہا:

I am sorry I served somebody until it was too late to discover he was nothing.

مجھے افسوس ہے کہ میں شاہ ایران کے احکام کی تعمیل کرتا رہا۔ میں اس کے بے حقیقت ہونے کو صرف اس وقت جان سکا جب کہ اس کو جاننے کا وقت نکل چکا تھا ——— یہی صورت زیادہ بڑے پیمانہ پر موت کے وقت پیش آتی ہے۔ آدمی اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ موت کا وقت آجاتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھ کھلتی ہے۔ اب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ جن خوش نما خیالات اور خوب صورت الفاظ کے سہارے وہ جی رہا تھا ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ موت کے جھٹکے کے بعد اچانک وہ ہوش میں آجاتا ہے۔ مگر اب اس کا ہوش میں آنا بے کار ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ بدلہ پانے کا وقت ہوتا ہے نہ کہ عمل کرنے کا۔

اسی طرح، رائٹر کے مطابق ایک اور ملزم جنرل خواجہ نوری نے عدالت کے سامنے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا:

Because of the heavy censorship, I was unaware of the real situation

"خبروں پر بھاری سنسر قائم ہونے کی وجہ سے میں حقیقی صورت حال سے بالکل بے خبر رہا"۔ آخرت کے اعتبار سے یہی انسان کا حال یہی ہے۔ آدمی اپنے خیالات میں اس طرح گم رہتا ہے کہ اس کو باہر کے حقائق دکھائی نہیں دیتے۔ وہ اپنی خواہشات کے خول میں بند رہتا ہے۔ وہ لفظی توجیہات وضع کرتا ہے اور ان کے سہارے جیتا رہتا ہے۔ وہ اپنے مطابق حق اور ناحق کا ایک خود ساختہ ڈھانچہ گھڑتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے حسب حال پاکر خوش ہوتا رہتا ہے۔ وہ اپنی خوش خیالیوں اور دنیوی کامیابیوں کے مطابق اپنے گرد ایک فرضی ہالہ بنالیتا ہے اور اس کے اندر اس طرح صبح و شام کرتا رہتا ہے جیسے وہ ابدی حصار میں آگیا ہے۔ آدمی اسی طرح اپنی زندگی کے دن گزارتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ موت آکر اس کے ذہنی فریب کا پردہ پھاڑ دیتی ہے۔ اب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس فکری گھروندے میں جی رہا تھا وہ فرضی طلسمات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ جن الفاظ کو لکھ اور بول رہا تھا وہ معانی سے بالکل خالی تھے۔ وہ جن کاموں میں مشغول تھا وہ عالم آخرت کے اعتبار سے کوئی قیمت نہ رکھتے تھے۔ جن مشاغل پر اس نے خدا اور اسلام کا بورڈ لگا رکھا تھا وہ محض اس کی ایک ذاتی تجارت تھی۔ وہ صرف اپنی انا کی تسکین کے لئے متحرک تھا نہ کہ حقیقۃً خدا کی رضا کے لئے۔

ضمیر — دنیا میں خدا کی عدالت ہے

مرحوم ذوالفقار علی بھٹو (۱۹۷۹ - ۱۹۲۸) کو قتل کے الزام میں راولپنڈی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم واجب القتل تھے یا نہیں، اس میں دنیا کے علما قانون کی دو رائیں ہیں۔ تاہم اس میں دو رائے نہیں کہ پاکستان کے علم برداران اسلام نے ۴ اپریل کی رات کو اس شخص کو قتل کر دیا جس کا نام "ذوالفقار علی بھٹو" تھا۔

اس سلسلے میں ہم پاکستان کے علم برداران اسلام سے صرف ایک بات کہنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ اصل مسئلہ دنیا کا نہیں بلکہ آخرت کا ہے۔ اگر فی الواقع آپ کے اس اقدام کا مقصد انصاف کے تقاضے پورا کرنا تھا تو اللہ کے یہاں آپ کے لئے اجر ہے۔ اور اگر یہ ایک قانونی ڈراما تھا جو سیاسی مقصد کے لئے کھیلا گیا تو آپ کو ڈرنا چاہئے کہ کل قائم ہونے والی بڑی عدالت میں آپ خدا کو کیا جواب دیں گے۔

ہم آپ سے گزارش کریں گے کہ آپ اپنا احتساب کر کے دیکھیں کہ آپ کہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ تنہائی کے وقت میں جب کہ نہ کوئی آپ کے آگے ہو اور نہ پیچھے، نہ کوئی دائیں ہو اور نہ کوئی بائیں۔ بس آپ ہوں اور آپ کا خدا ہو۔ ایسے عالم میں آپ اپنے کو بے پردہ کر کے دیکھیں کہ اس پھانسی کا محرک آپ کے لئے کیا تھا۔ کیا یہ کہ ایک بے گناہ انسان کے قاتل کو اس کے قتل کی سزا مل جائے۔ یا اس کے پیچھے یہ چھپا ہوا جذبہ کام کر رہا تھا کہ ایک سیاسی حریف جس کے متعلق آپ جان چکے تھے کہ الکشن کے میدان میں آپ اس کو شکست نہیں دے سکتے، اس کو قتل کر کے ہمیشہ کے لئے سیاست کے میدان سے ہٹا دیں۔ خواہ اس مقصد کے لئے ایک عدالتی ڈراما ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

تنہائی کا احتساب جس میں آپ کا دل لرز رہا ہو اور آخرت کے خوف سے آپ کی پلکیں بھیگ گئی ہوں، اگر آپ کو یہ بتائے کہ آپ نے صرف ایک "قاتل" کو اس کے قتل کے جرم کی سزا دینے کے لئے ایسا کیا ہے، اس میں کوئی سیاسی جذبہ شامل نہیں ہے تو بلاشبہ آپ اللہ کے نزدیک بری الذمہ ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ اپنا احتساب کرتے وقت آپ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جائیں۔ آپ کو ایسا محسوس ہو کہ آپ کی اندرونی آواز آپ کی زبان سے بولے ہوئے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی ہے تو سمجھ لیجئے کہ خدا کے گواہ کی گواہی آپ کے خلاف ہے۔ آپ سے اتنا بڑا جرم ہو گیا ہے کہ آخرت میں ہمالیہ پہاڑ کے برابر سونا دے کر بھی آپ اپنے کو بری الذمہ نہ کرا سکیں۔ اس دن نہ کسی "جنرل" کو اس کی مسلح فوج بچانے والی ثابت ہو گی اور نہ کسی "اسلام پسند" کو کوئی فوجی حکمراں۔ آج کے تمام بامعنی الفاظ اس وقت بے معنی ہو جائیں گے۔ آج کے تمام ساتھی اس دن ساتھ چھوڑ دیں گے۔ حتی کہ وہ لوگ بھی جو آج آپ کو مبارک باد کے تار بھیج رہے ہیں۔

باہر کے جن لوگوں نے اس کارروائی کی تائید کی، ان کا معاملہ بھی یہی ہے۔ وہ اپنے اندر جھانک کر دیکھیں۔ اگر وہ پائیں کہ ان کی تائید صرف اس لئے تھی کہ قاتل کو اس کے قتل کی سزا ملے تو اللہ کے یہاں ان کے لئے اجر ہے۔ اور اگر اس کے پیچھے دوسرے محرکات کام کر رہے ہوں تو وہ بھی یکساں طور پر اس ذمہ داری میں شریک ہیں۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے: اذا عملت الخطیئۃ فی الارض ۔ ۔ ۔ من غاب عنہا فرضیہا کان کمن شہدہا (ابوداؤد) ■

نظام مصطفےٰ کی نئی تعبیر

ذوالفقار علی بھٹو کی قید کے زمانہ میں پاکستان قومی اتحاد کے ایک حامی اخبار نے طنزیہ انداز میں لکھا تھا:

"۔۔۔اب تو بھٹو نے جیل میں سجادہ بچھالیا ہے، نمازیں پڑھنا شروع کر دی ہیں اور تسبیح ہاتھ میں لئے اوراد و وظائف میں مشغول دکھائی دیتے ہیں (المنبر فیصل آباد ۲۳ مئی ۱۹۷۸) ۴ اپریل ۱۹۷۹ کو راولپنڈی جیل میں مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ بی بی سی نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ مسٹر بھٹو کو جب پھانسی کے تختہ پر کھڑا کیا گیا تو آخری کلمات جو ان کی زبان سے نکلے وہ یہ تھے: "خدایا میری مدد کر، میں بے قصور ہوں" رپورٹر مسٹر مارک ٹولی (Mark Tully) کے لئے دنیا کو اس واقعہ کی خبر دینا اتنا مہنگا ثابت ہوا کہ نظام مصطفےٰ کے علم بردار نوجوانوں نے اسلام آباد میں رپورٹر کو گھیر کر اسٹک سے مارا اور حکومت نے اس کے خلاف راولپنڈی کے مجسٹریٹ کے یہاں مقدمہ دائر کر دیا ــــــ نظام مصطفےٰ کی یہ قسم بالکل نئی ہے کہ اس کے علم بردار کسی شخص کو صرف اس کے جرم کی سزا دینا کافی نہیں سمجھتے، اسی کے ساتھ وہ اس کو جہنم میں پہنچانا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔

ہم کو عیسائی ہوجانا چاہیے

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد ۵ اپریل ۱۹۷۹ کو راولپنڈی میں تعزیتی جلسہ ہورہا تھا۔ عورتیں اور مرد جمع تھے۔ غیر ملکی نامہ نگار بھی جائزہ لینے کے لئے آگئے۔ اس موقع پر ایک پاکستانی مسلم خاتون نے ایک مغربی نامہ نگار سے بات کرتے ہوئے کہا:

If this is Islam, we should all become Christians

اگر یہی اسلام ہے تو ہم سب کو عیسائی ہوجانا چاہیے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۶ اپریل ۱۹۷۹) خاتون کے جملہ کا مطلب یہ تھا کہ اسلام اگر اس کا نام ہے کہ اپنے سیاسی حریفوں کو اخلاقی مجرم بنا کر قتل کر دو تو ایسے اسلام سے مسیحیت بہتر ہے۔ یہ ہے وہ اسلام جس کی گواہی موجودہ زمانہ میں "نظام مصطفےٰ" کے علم بردار دے رہے ہیں۔

ایک اقدام سے کئی مسئلے پیدا ہوتے ہیں

مسٹر اندر ملہوترا نے ایک مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ مسٹر بھٹو کی پھانسی کے کیا کیا اثرات کشمیر کی سیاست پر پڑے ہیں۔ اس سلسلہ میں کشمیری مسلمانوں کی ناراضی اور "ضیاء الحق مردہ باد" کے نعروں کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

---Despite the law and order problem that has been created in the valley, the present situation provides this country with an opportunity to eliminate once and for all, the 'Pakistan Factor' from the politica of Kashmir.
The Times of India, April 12, 1979

پاکستان کی موجودہ حکومت کے خلاف کشمیر میں جو مظاہرے ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے اگرچہ وادی میں امن و نظم کے مسائل پیدا ہوگئے ہیں، مگر یہ صورت حال ہندستان کے لئے موقع دے رہی ہے کہ وہ کشمیر کی سیاست سے "پاکستانی عامل" کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے ــــــ اجتماعی زندگی میں کوئی اقدام بے شمار پہلوؤں سے اپنے اثرات چھوڑتا ہے۔ تاہم جو لوگ خودغرضی اور عداوت کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ ان پہلوؤں کو بہت کم دیکھ پاتے ہیں۔

جب زبان والے بے زبان ہو جائیں گے

قرآن میں قیامت کے دن کا حال بتاتے ہوئے کہا گیا ہے: وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (تکویر) یعنی اس دن زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی۔ قدیم زمانہ میں بعض عرب قبائل لڑکے کو اپنے لئے عزت اور طاقت کا نشان سمجھتے تھے اور اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو اس کو اپنے لئے مصیبت خیال کرتے تھے۔ یہ احساس کبھی اتنا شدید ہوتا کہ اپنی لڑکی کو پیدا ہونے کے بعد زندہ دفن کر دیتے۔ اس آیت کا اولین مصداق قدیم زمانہ کے عربوں کا یہی رواج ہے۔ تاہم بالواسطہ طور پر اس حکم میں اسی نوعیت کے دوسرے واقعات بھی شامل ہوں گے۔

ایک شخص ہے جس کی بعض غفلتوں سے موقع پا کر کچھ لوگ اس پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ اس کو گرفتار کرتے ہیں۔ اس کو مجرم قرار دینے کے لئے سازشیں کرتے ہیں۔ اس پر بے ثبوت الزامات لگاتے ہیں فرضی عدالتیں قائم کرتے ہیں اور اس پر مقدمہ چلا کر اس کے خلاف تمام نہاد قانونی فیصلے حاصل کرتے ہیں اور پھر اس کو پھانسی کے تختہ پر چڑھاتے ہیں یا گولی مار کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ ایسے تمام لوگ بھی گویا اپنے آپ کو اسی مجرمانہ کٹہرے میں کھڑا کر رہے ہیں جہاں عرب کا وہ قدیم جاہل انسان کھڑا ہوا ہے جس نے اپنی بے گناہ بیٹی کو گڑھے میں دھکیل کر اوپر سے مٹی بھر دی تھی۔ کیونکہ کوئی فرد ہو یا حکومت، کسی کو حق نہیں ہے کہ جرم کے شرعی ثبوت کے بغیر کسی کو اس کی جان سے محروم کر دے۔ جو لوگ کسی کو اس قسم کی سزا دیں، جو ایسے بے ثبوت فیصلے کریں، جو اس کی موافقت میں بیانات جاری کریں، جو اس قسم کے معاملہ پر راضی ہوں اور زبان یا قلم سے اس کی تائید کریں، سب کے لئے یہ اندیشہ ہے کہ قیامت کے ہولناک دن خدا غضب ناک ہو کر ان سے پوچھے: تم نے کس جرم میں میرے اس بندے کو قتل کیا تھا۔ اور پھر اگر خدا اپنے فرشتوں کو یہ حکم دے کہ میرے اس مقتول بندے کو اس کی تمام غلطیوں کے باوجود آج زندگی دے دو اور اس کے قاتلوں کو اور قتل کی حمایت کرنے والوں کو ان کے تمام شاندار کارناموں کے باوجود موت کے گڑھے میں پھینک دو تو کون ہے جو قیامت کے دن خدا کو ایسے ایک فیصلہ سے روکنے والا ہو۔

اسی طرح ایک شخص ہے جو لوگوں کو ان کی غفلتوں اور شرارتوں پر متنبہ کرتا ہے۔ وہ ان کے اوپر تنقید کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ تمام لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں جن پر اس کی تنقیدوں کی زد پڑتی ہے۔ وہ بگڑ جاتے ہیں اور اس شخص کے بارے میں بے بنیاد باتیں مشہور کر کے اس کی کردار کشی کرتے ہیں۔ اس کے خلاف بے ثبوت شوشے چھوڑ کر اس کی دیانت داری کو لوگوں کی نظر میں مشتبہ بنا دیتے ہیں۔ اس کا علمی اور اشاعتی بائیکاٹ کر کے اس کو گمنامی کی قبر میں دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس پر جھوٹے مقدمے چلا کر اس کے لئے غیر ضروری مسائل پیدا کرتے ہیں اور اس کو ذہنی عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ سارے لوگ بھی درجہ بدرجہ انھیں مجرم باپوں کی صف میں شامل ہیں جن کے اوپر خدا اتنا غضبناک ہوگا کہ ان کی طرف دیکھے گا بھی نہیں اور زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے خطاب کرتے ہوئے فرمائے گا: تو کس جرم میں گاڑی گئی تھی۔ جس طرح بیٹی کو مار کر عرب باپ کا خوش ہونا اس کے کام نہ آیا، اسی طرح ان دوسرے لوگوں کی جھوٹی خوش خیالیاں بھی ان کے کچھ کام نہ آئیں گی اور عجب نہیں کہ آخرت میں وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں (۱۸ اپریل ۱۹۷۹) ■

آخرت کا راستہ صبر کا راستہ ہے

• وہ لوگ اپنے واجبات کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ وہ اللہ کی محبت میں غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم تم کو صرف اللہ کی رضامندی کے لئے کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے ہیں اور نہ شکر گزاری چاہتے ہیں۔ ہم کو تو اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ ہے۔ پس اللہ ان کو اس دن کی سختی سے بچائے گا اور ان کو تازگی اور خوشی عطا کرے گا اور ان کے صبر کے بدلے ان کو جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔ وہ وہاں تختوں پر مسندیں لگائے ہوئے ہوں گے۔ وہاں نہ گرمی کی تکلیف ہوگی اور نہ سردی کی۔ جنت کے درخت ان پر جھکے ہوئے سایہ کر رہے ہوں گے۔ اس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے۔ لوگ ان کے پاس چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے لئے پھر رہے ہوں گے۔ وہ شیشے بھی چاندی کے ہوں گے جن کو بھرنے والوں نے ٹھیک اندازہ کے مطابق بھرا ہوگا۔ ان کو وہاں ایسے پیالے پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔ یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جس کو سلسبیل کہا جاتا ہے۔ ان کی خدمت کے لئے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے رہیں گے۔ تم ان کو دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیئے گئے ہیں۔ وہاں تم جدھر بھی نگاہ ڈالو گے ہر طرف نعمتیں اور بڑی بادشاہی دیکھو گے۔ ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے۔ ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب ان کو پاکیزہ شراب پلائے گا۔ یہ ہے تمہارا بدلہ اور تمہاری کوشش اللہ کے یہاں مقبول ہوئی (الدھر)

قرآن کا یہ ارشاد بتا رہا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کی کوششیں آخرت میں سعی مشکور (دہر ۲۲) کا درجہ حاصل کریں گی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت کی ہولناکیوں کا اتنا شدید احساس رکھتے ہوں کہ وہ ان کے اوپر ایک قسم کا آسمانی محاسب بن کر چھا جائے۔ ان کا حال یہ ہو جائے جیسے کہ وہ موت کے دوسری طرف جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور اسی کے زیر اثر سارا کام کر رہے ہیں۔ وہ جب کوئی عہد کریں، خواہ منت کا عہد ہو یا ایمان کا عہد یا قول و قرار کا عہد، تو وہ اس کو اس طرح پورا کریں جیسے وہ بے پناہ یقین کے ساتھ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر انھوں نے اس کو پورا نہ کیا تو جہنم کی آگ انھیں پکڑ لے گی۔ ان کا ایمان باللہ ان پر جن باتوں کو لازم کر رہا ہے اور ان کا عہد ان کو جن چیزوں کا پابند بنا رہا ہے، ان کو وہ اس طرح پورا کریں جیسے وہ ایک ایسی سرحد پر کھڑے ہوئے ہیں جہاں ان کے لئے دو میں سے صرف ایک چیز کے انتخاب کا سوال ہے۔ یا قول و قرار کے تقاضوں کو پورا کرنا یا جانتے بوجھتے اپنے آپ کو جہنم کے الاؤ میں گرا دینا۔

آخرت کے احساس ہی کے تحت ان کے اندر جو دوسری خصوصیت پیدا ہوتی ہے وہ بندوں کے ساتھ مہربانی ہے۔ وہ اپنے لئے اپنے رب سے مہربانی چاہتے ہیں اس لئے وہ خود بھی دوسروں کے ساتھ مہربانی کرتے ہیں وہ اپنی کمائی میں محتاجوں کا حق سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کا سہارا بنتے ہیں جو حالات کے نتیجہ میں بے بس ہو گئے تھے یا بندشوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ بندگان خدا کی خدمت کا یہ کام جو وہ کرتے ہیں، بدلہ اور شکرانہ وصول کرنے کے لئے نہیں کرتے۔ اس کا محرک تمام تر یہ ہوتا ہے کہ آخرت کے دن جب وہ خدا کے سامنے تمام کمزوروں سے زیادہ کمزور حالت میں کھڑے

ہوں، اس وقت ان کا خدا ان کو بے یار و مددگار نہ چھوڑے بلکہ ان کی مدد فرمائے۔ دنیا کی زندگی میں کسی کے ساتھ اچھا سلوک ان کے لئے دراصل ایک عملی دعا ہوتی ہے۔ وہ بھوکے کو کھلاتے ہیں تاکہ خدا ان کو کھلائے، وہ کمزوروں کو سہارا دیتے ہیں تاکہ خدا ان کو سہارا دے۔ وہ انسانوں کی طرف سے ڈالی ہوئی تکلیفوں کو معاف کرتے ہیں تاکہ خدا ان کی غلطیوں کو معاف کر دے۔

ان لوگوں کو یہ نعمتیں اس لئے ملیں گی کہ انھوں نے صبر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا میں کل کی دنیا کے لئے جینا، دکھائی دینے والے "جنت اور جہنم" کو نظر انداز کر کے نہ دکھائی دینے والے جنت و جہنم کے لئے سرگرم ہونا ایک بے حد مشکل کام ہے۔ اس میں ہر وقت آدمی کے صبر کا امتحان ہے۔ اس راہ میں کہیں ملتے ہوئے فائدوں سے محرومی کو گوارا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی خارجی مجبوری کے بغیر خود سے اپنے آپ کو کسی چیز کا پابند کر لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنی بے عزتی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کہیں زیادہ کو چھوڑ کر کم پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ کہیں قدرت رکھتے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں کو روک لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنی مقبولیت کو دفن کرنے پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ کہیں شہرت اور استقبال کے راستے کو چھوڑ کر گمنامی کے طریقے کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ کہیں الفاظ کا ذخیرہ ہوتے ہوئے اپنی زبان کو بند کر لینا پڑتا ہے۔ کہیں جانتے بوجھتے دوسرے کا بوجھ اپنے سر پر لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنے آپ کو ایک ایسے کام میں شریک کرنا پڑتا ہے جس میں کسی قسم کا کوئی کریڈٹ ملنے والا نہیں۔ غرض جنت کی طرف سفر کا سارا معاملہ صبر و برداشت کا معاملہ ہے۔ جو اپنے آپ کو دبانے اور کچلنے کے لئے تیار نہ ہو وہ کبھی اس راہ کو طے نہیں کر سکتا:

وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللہ خیر لمن آمن وعمل صالحا ولا یلقّٰھا الا الصٰبرون (قصص ۸۰)	اور کہا ان لوگوں نے جن کو علم ملا تھا، خرابی ہو تمھاری۔ اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لئے جو ایمان لایا اور نیک عمل کیا۔ اور یہ بات انھیں کے دل میں پڑتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

دنیا کی زندگی دراصل صبر کا امتحان ہے۔ صبر کی ایک قسم وہ ہے جو باہر کی دنیا کے خلاف ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی ماحول کی رکاوٹوں کا خاموش مقابلہ کرتے ہوئے اپنے دینی سفر کو جاری رکھتا ہے۔ مگر سب سے بڑا صبر وہ ہے جو خود اپنے خلاف پیش آتا ہے۔ زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آنے کی وجہ سے اپنے کسی بھائی کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، ایسے موقع پر منفی جذبات کی پرورش سے اپنے کو روکنا پڑتا ہے۔ کسی کی ترقی اور مقبولیت کو دیکھ کر اس کے خلاف حسد جاگ اٹھتا ہے۔ اس وقت دشمن جیسی بے رحمانہ نظر سے اپنے دل کو ٹٹولنا پڑتا ہے تاکہ حسد اور رقابت کے بیج کو نکال پھینکا جائے۔ کبھی آدمی ایک شخص کو اچھا سمجھتا ہے حالاں کہ اس کی وجہ صرف اس کا نیازمندانہ انداز ہوتا ہے اور کبھی ایک شخص کو برا سمجھتا ہے حالاں کہ اس کی وجہ صرف اس کا تنقید و احتساب کا مزاج ہوتا ہے، ایسے مواقع پر اپنے آپ کو کھینچ کر ایسے مقام پر لے جانا پڑتا ہے جہاں وہ تعریف و تنقید سے بلند ہو کر دوسروں کے بارے میں رائے قائم کر سکے۔ دوسروں کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی کے بغیر کوئی شخص دین دار نہیں بنتا اور انصاف اور خیر خواہی پر قائم ہونا صبر کے بغیر ممکن نہیں۔

ذہنی خول : سب سے بڑی رکاوٹ

وقال الذین کفروا للذین آمنوا لوکان خیرا ماسبقونا الیہ ، واذلم یہتدوا بہ فسیقولون ھٰذا افک قدیم (احقاف ۱۱)

انکار کرنے والے لوگ ماننے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ قرآن اگر کوئی اچھی چیز ہوتی تو اس کو قبول کرنے میں یہ لوگ ہم سے آگے نہ نکل جاتے۔ جب وہ اس کے بتانے سے راہ پر نہیں آئے تو اب وہ کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔

کسی معاشرہ میں جب حق کی آواز بلند ہوتی ہے تو عام طور پر وہ لوگ اس کی طرف کھنچتے ہیں جو کسی نہ کسی قسم کی کمی سے دوچار ہوں اور اپنے اندر خلا محسوس کرتے ہوں۔ ان کا اندرونی خلا کا احساس ان کے لئے ایک مددگار قوت بن جاتا ہے اور وہ کسی حجاب یا رکاوٹ کے بغیر حق کو پالیتے ہیں اور اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔

اس کے برعکس وہ لوگ جن کی عزت و شہرت کے کھونٹے گڑے ہوئے ہوں، جو فتح و کامرانی کے احساس میں گمن ہوں جن کی تمام ضرورتیں بافراط پوری ہو رہی ہوں، جن کو ہر طرف اپنے لئے میدان کھلے ہوئے نظر آتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے اندر ایک قسم کی قناعت پیدا ہو جاتی ہے، وہ اپنے سے باہر کسی آواز کو اپنانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

حق کی آواز کو قبول کرنے میں سب سے زیادہ پیچھے وہ لوگ رہتے ہیں جن کو روایتی مذہبی نظام میں بڑی بڑی گدیاں حاصل ہو گئی ہوں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اسلاف کا جانشین کہا جاتا ہے۔ مذہب کی نمائندگی کے اسٹیج پر وہ تقریری کمال دکھا رہے ہوتے ہیں، صدارت اور استقبال کے اعزازات ہر جگہ ان کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ہدیے اور نذرانے کی رقمیں ان کے پاس اس طرح آنے لگتی ہیں گویا وہ مذہبی شہزادے ہیں اور ساری قوم ان کی باج گزار ہے۔ یہ صورت حال ان کے اور ان کے پیروؤں کے اندر یہ جھوٹا یقین پیدا کر دیتی ہے کہ وہی حق پر ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ حق کی آواز کی طرف نسبتاً کمتر درجہ کے لوگ بڑھ رہے ہیں، اور وہ اپنے اندر اس کے لئے کشش نہیں پاتے، تو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ حق نہیں ہے۔ اگر وہ حق ہوتا تو لازم تھا کہ وہ سب سے پہلے ان کو اپنی طرف کھینچتا۔

خدا کو پانے کی واحد قیمت اپنی ذات کی نفی ہے۔ اپنی نفی کے بعد ہی خدا کا اثبات ہوتا ہے۔ خدا ظاہر کو نہیں باطن کو دیکھتا ہے۔ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس ہوتا ہے۔ وہ ان سینوں میں اترتا ہے جنھوں نے غیر خدائی چیزوں سے اپنے کو پوری طرح خالی کر لیا ہو۔ جب آدمی اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں وہ خدا کا ہم صحبت بن سکے تو یہ وقت وہ ہوتا ہے جب کہ وہ ان دنیوی زخارف سے خالی ہو چکا ہوتا ہے جو انسانوں کی نظر میں اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کی نظریں دنیا کی چمک دمک سے اوپر نہ اٹھی ہوں وہ ان کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتے۔ ایسے انسان کو وہ حق کا علمبردار سمجھنے کے بجائے ایک سرپھرا آدمی سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اپنی "گدیوں" پر بیٹھے ہوئے نہایت اطمینان سے کہہ دیتے ہیں: برخود غلط قسم کے لوگ ہمیشہ اس قسم کا ڈھونگ کھڑا کرتے رہتے ہیں، یہ بھی اسی فہرست میں ایک اضافہ ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

آخرت میں اللہ عیاناً سامنے آجائے گا۔ مگر موجودہ دنیا میں اللہ پر اس حال میں ایمان لانا ہے کہ وہ حالت غیب میں ہے۔ یہاں خدا کی نشانیوں سے خدا کو پہچاننا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس دنیا میں خدا دلیل اور برہان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ آیات اللہ پر غور کرو۔ اللہ کی آیتوں کو ماننا خدا کو ماننا ہے۔ اور اللہ کی آیتوں کا انکار کرنا خدا کا انکار کرنا ہے۔ آیات کیا ہیں۔ یہ خدا کو پہچاننے کے دلائل ہیں جو کبھی فطرت کے اشاروں میں اور کبھی داعی کے الفاظ کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

صحیح دلیل خدا کی طرف سے آئی ہوئی بات ہوتی ہے۔ اس کی صحت کو پالینا خدا کو پالینا ہے اور اس کے آگے جھکنا خدا کے آگے جھک جانا۔ صحیح دلیل سامنے آنے کے بعد جو شخص جدال کرے، جو اپنی دولت اور وجاہت کے گھمنڈ میں اس کو نظر انداز کردے، وہ گویا خدا کو نظر انداز کر رہا ہے۔ اس کی مثال ایسے شخص کی مانند ہے جس کے پاس خدا خود آیا مگر اس نے خدا کا استقبال نہ کیا۔

پیغمبروں نے خدا کی طرف سے حق کی آواز بلند کی۔ مگر وقت کے غالب لوگوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کی بڑی وجہ ان کی خود فریبی تھی۔ چوں کہ وہ وقت کی معاشیات پر قابض تھے۔ اقتدار کے اداروں میں ان کو رتبہ حاصل تھا۔ اعوان و انصار کی بھیڑ ان کے گرد جمع تھی۔ اس بنا پر ان کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ حق پر نہیں ہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ جس چیز کو حق کہا جاتا ہے اس کا انکار کرنے سے ان کا کچھ نہیں بگڑا۔ ان کا دبدبہ بدستور قائم ہے۔ ان کے مواقع پھر بھی کھلے ہوئے ہیں اور ان کے دنیوی کام اس کے باوجود بن رہے ہیں تو وہ ایک قسم کے نفسیاتی فریب میں مبتلا ہو گئے۔ وہ داعی حق کے مقابلہ میں اپنی کامیابیوں کو دیکھ کر دھوکے میں پڑ گئے۔ وہ سمجھنے لگے کہ "جب میں کامیاب ہوں تو یقیناً میں ہی حق پر ہوں"۔

ظاہری کامیابی کسی کے برسرِ حق ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ مگر ظاہری کامیابی اکثر آدمی کو خود فریبی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ آدمی کا رب بعض اوقات اس کو وقتی اور ظاہری کامیابی اس لئے دے دیتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ اس کو آزمائے۔ وہ دیکھے کہ کیا وہ اپنی کامیابیوں کو دیکھ کر دھوکے میں پڑ جاتا ہے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ذہنی خول میں اپنا ایک گھروندا بنا لیتا ہے اور اسی کے اندر جینے لگتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس کے خیالی گھروندے کا حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ اپنے خود ساختہ گھروندے کے خانہ میں چوں کہ اس کو اپنی ذات درست نظر آتی ہے۔ اس لئے وہ سمجھ لیتا ہے کہ فی الواقع بھی وہ درست اور صحیح ہے۔

خدا زمین و آسمان کی خاموش زبان میں بولتا ہے۔ وہ اپنے چنے ہوئے بندوں کے ذریعہ اپنی بات کا اعلان کرتا ہے وہ انسان کے ضمیر میں داخل ہو کر حقیقت کا آئینہ اس کے سامنے کر دیتا ہے۔ مگر انسان اپنی جھوٹی خوش گمانیوں کی وجہ سے ان پر دھیان نہیں دیتا۔ خدا اس کو سچائی کی جھلک دکھاتا ہے۔ مگر وہ اپنے نفسیاتی بندھنوں کو توڑ کر اس کی طرف نہیں دوڑتا۔ خدا کا حسین روپ اس کے سامنے کھولا جاتا ہے۔ مگر وہ اس کی قدر دانی کا حق ادا نہیں کرتا۔ موت ان جھوٹی خوش گمانیوں کے طلسم کو توڑ دے گی۔ اس وقت آدمی کو معلوم ہوگا کہ وہ جہنم کے کنارے کھڑا ہوا تھا اگرچہ وہ اپنے آپ کو جنت کا مالک سمجھ رہا تھا۔ ■

خدا کی ایک سنت یہ بھی ہے

جب کسی قوم میں کوئی پیغمبر آتا ہے اور وہ قوم اس کی بات ماننے پر تیار نہیں ہوتی، تو خدا کی طرف سے ان کو بعض مشکلوں میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ ان میں قبولیت کا مادّہ پیدا ہو۔ "اور ہم نے تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف رسول بھیجے تھے، پھر (جب انھوں نے نہیں مانا تو) ہم نے ان کو سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں۔ (انعام) اس قسم کے بعض واقعات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پیش آئے ہیں (مومنون ـ ۷۶) صحیحین میں عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ نبوت کے چند سال بعد جب مکہ والوں کی مخالفت اور سرکشی بہت بڑھ گئی تو تو آپ نے دعا فرمائی:

اللھم اعنی علیھم بسبع کسبع یوسف — خدایا ان کے مقابلہ میں میری مدد یوسفؑ کے سات سالہ قحط جیسے سات برسوں سے کر۔

اللہ نے دعا قبول فرمائی اور ایسا شدید کال پڑا کہ لوگ ہڈیاں اور چمڑا اور مردار تک کھانے پر مجبور ہوگئے۔ اس زمانہ میں یہ حال تھا کہ جب ایک شخص آسمان کی طرف نظر اٹھاتا تو بھوک کی شدت کی وجہ سے اس کو اوپر دھواں ہی دھواں دکھائی دیتا تھا۔ آخر ابوسفیان نے آکر آپ سے کہا کہ آپ تو صلہ رحمی کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ کی قوم بھوکوں مر رہی ہے۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ اس مصیبت کو ہم سے دور کر دے۔ قریش کے لوگ عام طور پر کہنے لگے تھے کہ خدایا ہم پر سے یہ عذاب دور کر دے تو ہم ایمان لائیں گے (دخان ۱۲) اللہ نے اپنے پیغمبر کی دعا قبول کی اور قحط کے حالات ختم ہوگئے۔ مگر ان کی سرکشی اس کے بعد بھی جاری رہی۔ یہاں تک کہ بدر کی جنگ کی شکل میں وہ پکڑ لیے گئے (دخان ۱۶) قرآن کی سورہ نمبر ۵۲ میں کہا گیا ہے:

بلاشبہ ظالموں کے لئے آخرت سے پہلے بھی عذاب ہے۔ مگر ان میں سے اکثر اس کو نہیں جانتے ــــ (طور ـ ۴۷)

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ظالمانہ روش اختیار کرتے ہیں، ان کو آخرت کے رسواکن عذاب سے پہلے دنیا میں تنبیہی عذاب دئے جاتے ہیں۔ یہ دنیوی عذاب اس لئے ہوتا ہے کہ ان کے ظلم کی ہلکی سی سزا انھیں اسی دنیا میں دی جائے تاکہ وہ اس سے سبق لے کر اپنی اصلاح کر لیں (لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون) مگر اکثر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اس قسم کی کوئی دنیوی سزا ان کو ملتی ہے تو فوراً اس کی تاویل کر لیتے ہیں۔ وہ اس کو کسی عام سبب کا نتیجہ قرار دے کر اپنے لئے یہ تسکین حاصل کر لیتے ہیں کہ یہ ان کی ظالمانہ روش کی خدائی سزا نہیں ہے بلکہ اس کے اسباب کچھ اور ہیں۔ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس لئے یہاں جو بھی خدائی نشانی یا سبق ظاہر کیا جاتا ہے وہ معمولی واقعات کے پردہ میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ پردہ داری دوبارہ لوگوں کے لئے فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ اس کو خدا کی طرف سے نہیں سمجھتے بلکہ ایک معمولی واقعہ سمجھ لیتے ہیں۔ جو وجہ "انسانی پیغمبر" کے انکار کی تھی، اسی بنا پر وہ ایک "دنیوی واقعہ" کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ■

بگاڑ کا سبب کیا ہے

دنیا میں بگاڑ کیوں ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ یہاں کوئی ایسی طاقت نہیں جو لوگوں کو مسلسل صدا اپنی گرفت میں لے سکے۔ ہر طاقت، خواہ وہ حکومت اور قانون کی ہو یا کوئی اور، اس کی گرفت انسانی زندگی میں ایک حد پر جاکر ختم ہوجاتی ہے اس کے بعد آدمی کا اپنا ارادہ شروع ہوجاتا ہے۔ آدمی کو صدفی صد اپنی گرفت میں لینے والا دو میں سے کوئی ایک ہی ہوسکتا ہے —— اللہ یا آدمی کا اپنا ارادہ۔

آخرت اللہ کی گرفت کے ظہور کا مقام ہے۔ اور دنیا انسانی ارادہ کی گرفت کا امتحان — آخرت میں تمام انسان براہ راست خدا کی مکمل گرفت میں آجائیں گے۔ کسی کو ادنیٰ درجہ میں بھی ذاتی اختیار باقی نہیں رہے گا۔ یہی کیفیت موجودہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ جو واقعہ آخرت میں براہ راست خدا کی طرف سے ہونے والا ہے، اسی کو دنیا میں خود اپنے ارادہ سے اپنے اوپر طاری کرنا ہے۔ اسی کا نام ایمان ہے۔ جنت اسی کے لئے ہے جو دنیا کی زندگی میں اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو صدفی صد اللہ کی گرفت میں دے دے۔ باقی وہ لوگ جو آخرت میں خدا کی گرفت میں آئیں، ان کا گرفت میں آنا ان کے کچھ کام نہ آئے گا۔ وہ دن تو مالک کائنات کی طرف سے باغی اور سرکش انسانوں کی گرفتاری کا دن ہوگا۔ یہ گرفتاری صرف اس لئے ہوگی کہ ایسے لوگوں کو جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ وہ کسی بھی درجہ میں ان کے کام آنے والی نہیں۔

اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نام ہے اپنے آپ کو حقیقت واقعہ کے مطابق بنانے کا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس کائنات میں ہر قسم کا اختیار و اقتدار صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسان کو بظاہر جو اختیار حاصل ہے، وہ محض عارضی ہے اور موت آتے ہی مکمل طور پر چھن جاتا ہے۔ اللہ کے مقابلہ میں اپنی اس عاجزانہ حیثیت کو موت سے پہلے مان لینا اور اپنے آپ کو ہمہ تن اس پر ڈھال لینے کا نام اسلام ہے۔ جس نے حالت غیب میں اپنے ارادہ سے ایسا کرلیا وہ جنتی ہے اور جو خدا کے ظاہر ہونے کے بعد اس کا اعتراف کرے اس کے لئے ابدی رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں:

یوم نقول لجہنم ھل امتلأت وتقول ھل من مزید۔ وازلفت الجنۃ للمتقین غیر بعید۔ ھذا ما توعدون لکل اواب حفیظ۔ من خشی الرحمٰن بالغیب وجاء بقلب منیب ادخلوھا بسلام ذلک یوم الخلود۔ لھم ما یشاءون فیھا ولدینا مزید

(ق ۳۵-۳۰)

جس دن ہم دوزخ سے کہیں گے کیا تو بھر گئی۔ وہ بولے گی کچھ اور بھی ہے۔ اور جنت ڈر والوں کے قریب لائی جائے گی کہ کچھ دور نہ رہے گی۔ یہ ہے جس کا وعدہ تھا ہر ایک رجوع کرنے والے یاد رکھنے والے سے۔ جو ڈرا اللہ سے بن دیکھے اور لایا دل جس میں رجوع ہے۔ جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہوجاؤ۔ یہ دن ہے ہمیشہ رہنے کا۔ ان کو جنت میں سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس زیادہ بھی ہے۔ ▪

شہادت کو وہ جنت کا مختصر راستہ سمجھتے تھے

شہید کے معنی گواہ کے ہیں۔ اس سے مراد اصلاً وہ لوگ ہیں جو دنیا میں لوگوں کو زندگی کی اس حقیقت سے باخبر کریں کہ مرنے کے بعد انھیں خدا کی عدالت میں حساب کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ جو لوگ دنیا میں چیاد تی دینے کا یہ کام کریں گے وہ آخرت کی عدالت میں خدا کی طرف سے بطور گواہ پیش ہوں گے۔ ان کی گواہی کی بنیاد پر ان لوگوں کے اخروی مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا جن کے اوپر انھوں نے دنیا کی زندگی میں گواہی دی تھی۔ تاہم شہید کا لفظ مقتول فی سبیل اللہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ کی راہ میں لڑکر جان دینے والوں کی فضیلت میں جو احادیث آئی ہیں، ان میں سے ایک حدیث یہ ہے:

عَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللهُ عنهُ أَنَّ رَسولَ اللهِ صلّى الله عليه وسلم قام فيهم فذكر أنَّ الجهادَ في سبيل الله وَالْإِيمَانَ بِاللهِ أَفْضَلُ الأَعْمَالِ، فقام رَجُلٌ فَقَال: يَا رَسُولَ اللهِ أرأيت إن قتلت في سبيل اللهِ تكفر عني خطاياي؟ فقال رسولُ اللهِ صَلّى الله عليه وسلم: نَعَمْ إن قُتِلْتَ في سبيل الله وانت صابر محتسب مقبل غير مدبر" ثمّ قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: "كيف قلت؟" قال: أرأيتَ إن قتلت في سبيل الله أتكفر عني خطاياي؟ فقال له رسول الله صلّى الله عليه وسلم: "نعم وانت صابرٌ محتسب مقبل غير مدبر، إلا الدين فإنّ جبريل قال لي ذلك" رواه مسلم

ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا بہترین اعمال ہیں۔ ایک شخص نے اٹھ کر سوال کیا: اے خدا کے رسول اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں تو کیا میری خطائیں معاف ہو جائیں گی۔ آپ نے فرمایا: "ہاں، اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ اور تم صابر ہو، اجر کے طلب گار ہو، آگے بڑھنے والے ہو، پیچھے مڑنے والے نہ ہو"۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم نے کس طرح کہا تھا، اس نے کہا: اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں تو کیا میری خطائیں معاف ہو جائیں گی۔ آپ نے فرمایا: ہاں، جب کہ تم صابر ہو، اجر کے طلب گار ہو، آگے بڑھنے والے ہو، پیچھے مڑنے والے نہیں ہو۔ سوا قرض کے کیونکہ جبریل نے مجھ کو یہی بتایا ہے۔

صحابہ کرام کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شہادت یا اللہ کی راہ میں قتل ہونے کو وہ جنت کا مختصر راستہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے رب کی جنت میں پہنچ جائیں۔ اللہ کی ناراضی سے بچنا اور اس کی رضا کو حاصل کرنا وہ چیز تھی جس کے لئے وہ سب سے زیادہ بے چین رہتے تھے۔ ہجرت کے بعد دشمنان اسلام سے مقابلہ چھڑا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اللہ کی راہ میں جان دے دینا اللہ کی رضا اور اس کی جنت حاصل کرنے کا یقینی ذریعہ ہے۔ یہ سن کر وہ بیتابانہ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ زندہ رہنے سے زیادہ اللہ کی خاطر مرجانا ان کے لئے محبوب بن گیا۔ کیونکہ یہ اللہ تک پہنچنے کا یقینی راستہ تھا اور اسی کے ساتھ قریبی بھی۔ شہادت ان کے لئے اللہ سے ملنے کا عنوان تھا نہ کہ حقیقۃً میدان جنگ کے لوگوں سے ملنے کا۔

ابن جریر نے شعبی کے واسطے سے نقل کیا ہے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ہرمز کے نام خط روانہ کیا، وہ ان دنوں ایران کی سرحد پر متعین تھا۔ انھوں نے لکھا:

اما بعد فاسلم تسلم او اعتقد لنفسك وقومك الذمة واقرر بالجزية والا فلا تلومن الا نفسك فقد جئتك بقوم يحبون الموت كما تحبون الحياة (تاریخ طبری، جلد ۲)

اما بعد۔ اسلام لاؤ نجات پاؤ گے۔ اسلام منظور نہیں ہے تو اپنی اور اپنی قوم کی طرف سے جزیہ ادا کرو۔ ورنہ اپنے سوا کسی اور کو ملامت نہ کرنا۔ کیوں کہ میں تمھارے اوپر ایک ایسی قوم لے کر آیا ہوں جس کو موت اسی طرح محبوب ہے جس طرح تم کو زندگی۔

صحابہ کرام اللہ کی راہ میں لڑکر شہید ہونے کو نہ صرف نجات آخرت کا یقینی ذریعہ سمجھتے تھے بلکہ ان کو یقین تھا کہ یہ وہ عمل ہے جو جنت کے سفر کو مختصر کر دیتا ہے۔ ابوبکر بن ابوموسیٰ اشعری رضی کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے باپ سے سنا۔ جنگ کا موقع تھا۔ دشمن سامنے تھے۔ انھوں نے کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ان ابواب الجنة تحت ظلال السيوف (جنت کے دروازے تلواروں کی چھاؤں میں ہیں) ایک شخص نے جو پھٹے کپڑے پہنے ہوئے تھا، کہا: اے ابوموسیٰ! کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں، وہ آدمی اسی وقت اپنے ساتھیوں میں آیا۔ ان کو سلام کیا۔ پھر اپنی تلوار کی میان توڑ ڈالی اور تلوار لے کر دشمنوں کی صف میں گھس گیا۔ وہ لڑتا رہا یہاں تک کہ مارا گیا (مسلم) جنگ بدر کے موقع پر جب دشمن بالکل قریب آگئے تو آپؐ نے فرمایا: قوموا الی جنة عرضها السموات والارض (ایسی جنت کی طرف چلو جس کی چوڑائی آسمان و زمین کے برابر ہے) عمیر بن حمام انصاریؓ نے کہا "آسمان و زمین جیسی چوڑی" آپؐ نے فرمایا ہاں۔ ان کی زبان سے نکلا بخ بخ (واہ واہ) آپؐ نے فرمایا تم نے بخ بخ کیوں کہا۔ انھوں نے جواب دیا: خدا کی قسم اس امید میں کہ شاید میں بھی جنت والوں میں ہو جاؤں۔ آپ نے فرمایا تم ان میں سے ہو۔ انھوں نے کھجور نکالی اور کھانے لگے۔ پھر بولے: لئن انا حييت حتى آكل تمراتي هذه انها لحياة طويلة (اگر میں ان کھجوروں کے کھانے تک زندہ رہوں تو یہ بڑی لمبی زندگی ہوگی) انھوں نے کھجوریں پھینک دیں دشمنوں میں گھس گئے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے (مسلم) انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ حرام بن ملحان رضؓ کو جبار بن سلمیٰ کلابی نے نیزہ مارا۔ زخم کاری تھا، جسم سے خون ابل پڑا۔ حضرت حرام کی زبان سے نکلا: اللہ اکبر! فزت ورب الکعبہ (کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہو گیا) یعنی جنت کو پانے میں (بخاری) عروہ بن زبیرؓ کہتے ہیں کہ ذی الحجہ ۸ ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار آدمی موتہ کی طرف روانہ کیے۔ یہ لوگ سرحد شام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہرقل ایک لاکھ یا دو لاکھ رومی لشکر کے ساتھ بلقاء میں ٹھہرا ہوا ہے۔ مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ مقابلہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کی تعداد سے مطلع کیا جائے۔ عبداللہ بن رواحہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا:

يا قوم! والله ان التي تكرهون للتي خرجتم تطلبون الشهادة (البدایہ والنہایہ جلد ۴)

لوگو! خدا کی قسم جس چیز کو تم ناپسند کر رہے ہو، وہ وہی ہے جس کے لیے تم نکلے ہو یعنی شہادت

خدمت دین کی مشکلات

پندرہ سال پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ رواں نامی بستی کے باہر ایک باغ میں جماعت اسلامی کا ضلعی ماہانہ اجتماع ہو رہا تھا۔ ظہر کا وقت تھا۔ اذان ہو چکی تھی، ایک بڑے درخت کے نیچے فرش بچھا ہوا تھا جہاں کچھ لوگ سنتیں پڑھ رہے تھے اور کچھ نماز کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک حادثہ پیش آیا۔ اجتماع کے بالکل قریب ایک بڑا سا گڑھا تھا جس کے عین کنارے سے راستہ گزرتا تھا۔ اس راستہ پر ایک بیل گاڑی جا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ گڑھے کے کنارے پہنچی اس کا ایک طرف کا پہیہ پھسل گیا اور پوری گاڑی کروٹ ہو کر گڑھے میں اس طرح گر گئی کہ ایک پہیہ اوپر کھڑا تھا اور دوسرا نیچے دبا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم میں سے کچھ لوگوں کی نظر اس پر پڑی، وہ فوراً اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑے۔ گاڑی سامان سے لدی ہوئی تھی۔ بیل بھی اس کے ساتھ جوئے میں پھنسے ہوئے تھے۔ بظاہر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ چند لوگ کیسے اس مسئلہ کو حل کر سکیں گے۔ مگر یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا، بلکہ فی الفور اقدام کرنے کا وقت تھا۔ آنے والے فوراً اپنے کام میں لگ گئے۔ کچھ نے نیچے سے زور لگایا اور کچھ نے اوپر سے پکڑ کر گاڑی کو اٹھانا شروع کیا۔ میں ان خوش نصیبوں میں تھا جو گاڑی کو نیچے سے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ یکایک ہم نے دیکھا کہ گاڑی اٹھا کر اوپر رکھ دی گئی ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ جو چند آدمی اس کام میں لگے تھے ان سب کا متفقہ احساس تھا کہ گاڑی ہم نے نہیں اٹھائی ہے، بلکہ وہ تو کسی اور نے اٹھا کر کھڑی کر دی ہے۔ نیچے ہاتھ دینے والوں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اوپر سے کوئی اس کو کھینچے چلا جا رہا ہے۔ اور جو لوگ اوپر تھے ان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا گاڑی نیچے سے اٹھتی چلی آرہی ہے۔

یہ واقعہ جو پچھلے پندرہ سال سے میری یادداشت کا بہترین سرمایہ رہا ہے اس کو میں نے قصہ خوانی کے طور پر آپ کے سامنے پیش نہیں کیا ہے، خدا مجھ کو اس سے بچائے کہ میں قصہ خوانی کو اپنا طریقہ بناؤں اور قصے سنانے میں آپ کا وقت ضائع کروں۔ میں نے اس کو صرف اس لئے بیان کیا ہے کہ آپ اس پر غور کریں۔ کیوں کہ اس کے اندر ہمارے لئے بڑی عبرت کا سامان ہے، یہ واقعہ ہمارے لئے اس بات کا پیغام ہے کہ خدا انسانوں کی مدد کرتا ہے، یہ ہمارے لئے خدا کی مدد کا ایک ذاتی تجربہ ہے۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہم پڑھتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ہماری اپنی زندگی میں پیش آیا ہے جس کا ہم نے براہ راست تجربہ کیا ہے۔ لدی ہوئی اور پھنسی ہوئی گاڑی کا محض چند آدمیوں کے ہاتھ لگانے سے دم بھر میں اٹھ کر کھڑی ہو جانا، یقیناً خدا کی مدد کی وجہ سے تھا۔ اگر ہم کو وہ آنکھیں حاصل ہوتیں جن سے غیر مادی حقیقتوں کو دیکھا جا سکے تو ہم دیکھتے کہ عین اس وقت جب کہ چند کمزور آدمی محض خدا کے بھروسے پر بالکل حسبۃً للہ ایک نیک کام کے لئے دوڑ پڑے تو اسی وقت آسمان سے فرشتوں کی بھی ایک فوج اتر آئی اور اس نے آن کی آن میں وہ کام کر دیا جو ہمارے کمزور ہاتھوں سے نہیں ہو سکتا تھا۔

دوستو! اسی طرح سے ایک اور گاڑی پھنسی ہوئی ہے۔ یہ دین کی گاڑی ہے۔ اسلام کی گاڑی چلتے چلتے حالات

میں پھنس گئی ہے۔ پاسبانوں کی غفلت سے باطل اس پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ زمین کی خرابی سے اس کے پہیے اپنی جگہ سے ہٹ گئے ہیں۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ آپ اس کے لئے دوڑ پڑیں۔ آپ اس کو اٹھانے کے لئے اپنے وجود کو لگا دیں۔ آپ کی زندگی کا بہترین مصرف، آپ کے اوقات کا اعلیٰ ترین استعمال اس وقت اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ آپ خدا کے دین کی گاڑی کو اٹھانے میں لگے ہوئے ہوں۔ اس زمین پر انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں۔ خدا کے دین کا مظلوم ہونا ہمارے لئے سعادت و کامرانی کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ اگرچہ دین اور اہل دین کے لئے انتہائی سخت حالت ہے، مگر انھیں سخت حالات میں ہمارے لئے اس سب سے بڑی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے جس کی اس دنیا میں کوئی شخص تمنا کر سکتا ہے۔

انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں کہ وہ خدا کے کام میں لگا ہوا ہو۔ ہمارا عاجز اور کمزور وجود خدا کی خدمت میں مصروف ہو، کیا اس سے بڑی بھی کوئی بات ہو سکتی ہے جس کی ہم آرزو کریں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی اس سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا کی مدد کے لئے اٹھنا خود ہم کو خدا کی مدد کا مستحق بناتا ہے۔ جب بندہ خدا کے کام میں مصروف ہوتا ہے تو وہ تنہا نہیں ہوتا، بلکہ خود خدا بھی اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ خدمت دین وہ بہترین وقت ہے جب بندے کو خدا کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ لمحات کس قدر قیمتی ہیں جب بندہ خدا کے ساتھ چل رہا ہو، جب وہ خدا کے سایہ میں سفر کر رہا ہو، جب خدا کے فرشتے اس کے ہم رکاب ہوں، جب وہ براہ راست خدا کی نگرانی میں آگیا ہو۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک معمولی آدمی کو اگر کسی حاکم کی معیت حاصل ہو جائے تو وہ پھولا نہیں سماتا۔ پھر خدا کی معیت اور اس کی مدد کا کیا ٹھکانا۔

دین آج جس چیز کا تقاضا کر رہا ہے، اسے آپ ہی کو پورا کرنا ہے۔ یہ کام آپ کو انجام دینا ہے۔ خدا کی طرف سے آپ کو ایمان کی توفیق ملنا اور آخری رسول کی امت میں شامل کیا جانا، گویا خدا کی طرف سے آپ کو اس کام پر مقرر کیا جانا ہے۔ آپ کا ایمان، اس کام پر آپ کے تقرر کا نشان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب کسی شخص کو کسی کام پر مقرر کیا جاتا ہے تو اس کے لئے اس کی ڈیوٹی کے مطابق تمام انتظامات بھی کر دیئے جاتے ہیں۔ ایک شخص کو حکومت کی طرف سے خط ملے کہ تم کو فلاں جنگلی علاقے میں فارسٹ افسر بنایا گیا ہے، تم وہاں جا کر اپنی ڈیوٹی سنبھالو۔ تو اس کے ذہن میں فوراً چند سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس وقت وہ سرکاری ملازمتوں کے متعلق حکومت کے شائع شدہ قواعد و ضوابط سے رجوع کرے تو وہ دیکھے گا کہ وہاں اس کے سارے سوالات کا پیشگی جواب لکھ دیا گیا ہے۔ "گھر سے ڈیوٹی کے مقام تک جانے کی صورت کیا ہو گی" جواب یہ کہ تم کو پوری مسافت کے لئے معقول سفر خرچ دیا جاتا ہے۔ "میں وہاں جا کر کس جگہ رہوں گا" اس کا جواب یہ ہو گا کہ وہاں تمہارے رہنے کے لئے سرکاری بنگلہ بنا ہوا ہے۔ "جنگل میں اپنی حفاظت کے لئے میں کیا کروں گا" حفاظتی دستہ تمہارے ساتھ موجود رہے گا۔ "گھر کے اخراجات کے لئے کیا ہو گا" تم کو ماہانہ تنخواہ کے طور پر ایک معقول رقم دی جائے گی۔ اسی طرح ملازم کے ہر سوال کا ایک اطمینان بخش جواب حکومت کے پاس موجود ہو گا۔ ہر تقرر لازماً یہ چاہتا ہے کہ جس کو مقرر کیا جائے، اس کی ضروریات اور مشکلات کا بھی اس میں پورا لحاظ کیا گیا ہو۔

اسی طرح خدا نے جب آپ کو ایک کام پر مقرر کیا ہے تو اسی کے ساتھ اس نے یقینی طور پر آپ کی ہر ضرورت کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ خدا تمام مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔ اس کے ہاتھ میں زمین و آسمان کا اقتدار ہے۔ ذرائع و وسائل کا

سارا خزانہ اس کی مٹھی میں ہے۔ ناممکن ہے کہ وہ اپنے عاجز اور حقیر بندوں کو ایک کام پر مقرر کرے اور پھر ان کی ضروریات کا لحاظ نہ کرے۔ یہ اس کی صفت رحیمیت کے خلاف ہے۔ یہ اس کی شان اقتدار کے منافی ہے۔ بلاشبہ اس نے خادمان دین کی تمام ضروریات کا اس دنیا میں مکمل انتظام کر دیا ہے۔ ایسا انتظام کہ آخرت میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دین کی خدمت کرنا چاہتا تھا مگر دشواریوں اور مشکلوں کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔

یہ انتظام کیا ہے اور ہم کس طرح اسے جانیں، اس کی میں نہایت آسان صورت آپ کو بتاؤں۔ آپ خدمت دین کے کام کا ارادہ کیجئے اور اس کے بعد سوچئے کہ اس کام میں آپ کی کیا کیا ضرورتیں ہو سکتی ہیں۔ جتنی معقول ضرورتیں اور واقعی مسائل آپ کی سمجھ میں آئیں، ان سب کی ایک فہرست بنا ڈالئے اور اس کے بعد خدا کی کتاب کھول کر اس کو ابتدا سے پڑھنا شروع کیجئے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ملازم سرکار اپنی ملازمت کے مسائل کے متعلق جاننے کے لئے حکومت کے قواعد و ضوابط کا مطالعہ کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ خدا کی کتاب آپ کے ہر معقول مطالبے کا قطعی اور یقینی جواب دیتی چلی جا رہی ہے۔ کسی بھی ایسی حقیقی ضرورت کا آپ تصور نہیں کر سکتے جس کا خدا کی کتاب ذمہ نہ لے رہی ہو۔ اس معاملہ میں ہرگز آپ کتاب الہٰی کو خاموش نہ پائیں گے۔ اس کے بعد مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خدا کی کتاب میں ہماری کسی ضرورت کے بارے میں ایک یقین دہانی کا مل جانا اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ہم اس پر بھروسہ کریں۔ ایمان کا مطلب خدا پر توکل ہے اور ایمان کے لفظی معنی بھروسہ اور اعتبار ہی کے آتے ہیں (یوسف ۱۱) خدا پر اور قرآن پر ایمان لانے کا اصل مطلب یہی ہے۔ اس لئے اگر ہم خدا کی کتاب میں ایک یقین دہانی پا لینے کے باوجود اس پر اعتماد نہ کریں تو یہ خود ہمارے ایمان کے خلاف ہوگا۔ ایسی صورت میں ہم کو خود اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنی چاہئے نہ کہ ہم قرآن کے الفاظ پر شبہ کریں۔

۱۔ آئیے ہم اس حیثیت سے قرآن کا ایک مختصر مطالعہ کریں۔ موجودہ زمانے میں دین کی خدمت کرنے کا ارادہ ہم سے کن ضرورتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک داعی کے سامنے سب سے پہلا سوال جو آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ بڑا مشکل کام ہے اور میں نہایت کمزور ہوں۔ خاص طور پر اس کے لئے زبان و قلم کی زبردست طاقت درکار ہے اور مجھے اس پر قدرت نہیں۔ اس کا آغاز زبان و قلم ہی سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے اپنی بے مائگی کا احساس اور حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے پست ہمتی ـــــ یہ دو چیزیں سب سے پہلے موجودہ زمانے میں دعوتی کام کی بات سوچنے والے پر طاری ہوتی ہیں۔

یہ مسئلہ ذہن میں رکھ کر جب ہم قرآن کے صفحات پر نظر ڈالتے ہیں تو بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کے ایک مرد صالح کو اللہ تعالیٰ کوہ طور پر بلا کر اس کو پیغمبری عطا کرتا ہے اور اس کو یہ خدمت سونپتا ہے کہ وہ فرعون اور مصر کی قبطی قوم کے پاس جا کر اس کو خدا کا پیغام پہنچائے۔ حضرت موسیٰ محکوم فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کو ملک کی حکمراں قوم کو خطاب کرنے کا کام سونپا جا رہا تھا۔ اس تقرر کو سن کر وہ بے اختیار کہہ اٹھے کہ خدایا میں اپنے اندر اس کی ہمت نہیں پا رہا ہوں اور میری زبان میرا ساتھ دیتی ہوئی نظر نہیں آتی :

رَبِّ إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يُكَذِّبُونِ وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنطَلِقُ لِسَانِي شعراء ۱۲-۱۳	خدایا مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔ ◄

خدا کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ تم ذرہ مت۔ تمھاری ضرورت کی سب چیزیں تم کو ہماری طرف سے دے دی گئیں ۔۔۔

قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰى (طٰہٰ - ۳۶)

یہ مانگنے اور دیے جانے کا واقعہ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے، وہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک واقعہ کی شکل میں ہماری اسی قسم کی مانگ کا جواب ہے۔ امت محمدیہ کے افراد جو ختم نبوت کے بعد نبوت کے کام پر مامور کیے گئے ہیں ان کے لیے بنی اسرائیل کے پیغمبر کا یہ واقعہ ایک پیشگی بشارت ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اگر تم ہمارے دین کی دعوت دینے کے لئے اٹھو تو ہم تم کو زبان دیں گے جس سے تم بولو گے، اور ہم تمھاری ڈھارس بندھائیں گے۔ جس کے بعد تم بڑے بڑے مواقع پر کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ہماری آواز پہنچا سکو گے۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر آج کسی بندۂ خدا کے اندر حقیقۃً داعی بننے کا جذبہ ابھر آئے اور وہ بے تابانہ اپنے رب کو پکار اٹھے کہ میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں مگر:

اللّٰھم یضیق صدری ولا ینطلق لسانی — خدایا میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان چلتی نہیں

تو یقیناً کلامِ الٰہی اس کو دوبارہ آواز دے گا کہے گا کہ جاؤ ہم نے تم کو وہ چیز دے دی جس کی تمھیں ضرورت تھی۔ وہی خدا آج بھی اس دنیا کا خدا ہے جس نے کوہ طور پر حضرت موسیٰ کو خطاب کیا تھا۔ وہ آج بھی وہی کچھ کر سکتا ہے جو اس نے ہزاروں برس پہلے اپنے ایک بندے کے ساتھ کیا تھا۔ وہ چاہے تو گونگے کو ناطق بنا دے اور بولتے ہوئے شخص کو گونگا کر دے۔ کم زور دل کو ہمت دے دے اور ہمت والے کو پست کر کے بٹھا دے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ پھر ہم کیوں نہ اس کے اوپر بھروسہ کریں۔

۲۔ دوسری ضرورت جس کا اس سلسلے میں سوال پیدا ہوتا ہے، وہ معاش کا مسئلہ ہے۔ آدمی جب دین کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی اپنی ضروریات تو ختم نہیں ہو جاتیں۔ اس کے جسمانی تقاضے، اس کا گھر، اس کا خاندان، اس سے بہت سی چیزیں مانگتے ہیں۔ اگر وہ دین کے کام کی طرف جھکے تو ذاتی کاموں میں کمی ہوتی ہے اور ذاتی ضروریات میں اپنی توجہ صرف کرے تو دین کا خانہ خالی رہ جاتا ہے۔ یہ دوسرا سوال ہے جو ہر داعی کے سامنے لازماً پیش آتا ہے اور اس کو پریشان کرتا ہے۔

یہ سوال لے کر ہم قرآن پڑھنا شروع کرتے ہیں تو بہت سے مقامات ہم کو ملتے ہیں جہاں اس معاملہ میں ہم کو خدا کی مدد کا یقین دلایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ہم قرآن کی ۶۵ ویں سورہ میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں یہ الفاظ لکھے ہوئے پاتے ہیں:

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (طلاق ۲)

جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ اس کے لئے کشادگی پیدا کر دے گا اور اس کو ایسی ایسی جگہوں سے رزق پہنچائے گا جہاں اس کا گمان بھی نہیں جا سکتا۔

یہ ایک بہت بڑی یقین دہانی ہے، یہ ایک عظیم انشورنس ہے جو خدا کی طرف سے اہل ایمان کو دیا گیا ہے۔ آج کا انسان سمجھتا ہے کہ صرف اس کا کھیت، اس کی دکان اور اس کی ملازمت واحد ذریعے ہیں جو کسی کو رزق دیتے ہیں۔ اس کو خدا کے عظیم سرچشمے کی سرے سے خبر ہی نہیں۔ اس کو معلوم ہی نہیں کہ یہاں ایک اور خزانہ ہے جو تمام معلوم خزانوں سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ یہاں ایک

اور دینے والا ہے جو تمام دینے والوں سے زیادہ دے سکتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ خدا کے خزانے کو چھوڑ کر بس ادنیٰ خزانوں کے سامنے دامن پھیلائے کھڑے ہیں۔ وہ چھوٹے ذریعہ کو پاکر خوش ہیں۔ حالاں کہ وہ اس سے بڑا ذریعہ بھی حاصل کر سکتے تھے۔
موجودہ انسان کی مثال اس بے صبرے نوجوان کی سی ہے جس کو گھر پر باپ کی وراثت میں معقول زمین ملی ہو۔ مگر دیہات کے خشک ماحول سے گھبرا کر وہ بمبئی بھاگ جائے اور وہاں واشنگ فیکٹری میں کلرکی حاصل کر کے سمجھے کہ میں نے اپنے رزق کا ذریعہ حاصل کر لیا۔ حالاں کہ بمبئی کی اس ملازمانہ زندگی میں وہ جو کچھ حاصل کر رہا ہے، اس سے بہت زیادہ خود اپنے گھر پر وہ اپنے کھیتوں اور باغوں میں کام کر کے آزادانہ طور پر حاصل کر سکتا تھا۔
۳۔ اب تیسری ضرورت کا تصور کیجئے جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب داعی مشکلات میں پھنس گیا ہو۔ جب حالات سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو گیا ہو، جب باطل طاقتیں اس کو کچلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہوں۔ یہ ہمارے احتیاج کا نازک وقت ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب داعی کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔
اس صورت حال کا احساس لے کر جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار نازک اوقات میں اہل ایمان کی مدد کی ہے۔ بلکہ ایسے وقت میں مدد کے لئے پہنچنا، اس نے اپنے اوپر اہل ایمان کا حق قرار دیا ہے۔

كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ	روم ۴۷	اہل ایمان کی مدد کرنا ہمارے اوپر اہل ایمان کا حق ہے

بندے کے لئے احتیاج کا انتہائی وقت، آقا کے لئے بھی اس کی طرف متوجہ ہونے کا انتہائی وقت ہوتا ہے حتیٰ کہ نازک اوقات میں وہ یہاں تک کرتا ہے کہ اپنی مخصوص فوج کو اہل ایمان کی کمک کے لئے روانہ کر دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ		جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اللہ نے جواب دیا کہ میں
بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ	(انفال۔ ۹)	ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد کروں گا

یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کے خادم، حقیقی خادم پر خدا کے دشمن حملہ آور ہوں۔ انھوں نے اس کا نرغہ کر لیا ہو، اور خدا بس دور سے اس کا تماشا دیکھتا رہے، یہ بالکل ناقابل تصور ہے۔ ایسے مواقع پر تو خدا کی غیرت وحمیت دوسرے مواقع کے مقابلے میں اور زیادہ شدت کے ساتھ بھڑک اٹھتی ہے۔ مگر مدد کا یہ معاملہ صرف ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو حقیقی خادم اور سچے وفادار ہوں۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں جب تیزپور میں چینی حملہ کا خطرہ بہت بڑھ گیا تھا حکومت ہند کا ایک اعلیٰ افسر وہاں سے ڈر کر قبل از وقت بھاگ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اس کو ملازمت سے برخاست کر دیا۔ اگر وہ جرأت اور وفاداری کے ساتھ اپنے مقام پر ڈٹا رہتا، تو ہو سکتا تھا کہ خطرہ پیش آنے کی صورت میں حکومت کا خاص ہوائی جہاز بھیجا جاتا تاکہ وہاں جا کر افسر اور اس کے خاندان کو شہر سے نکال لائے۔
یہ چند مثالیں یہ سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ کس طرح خدا نے اپنے دین کے خادموں کی تمام ضروریات ومسائل کا ذمہ لیا ہے۔ مگر یاد رکھئے قرآن میں ہماری ضرورتوں کے بارے میں یہ جو یقین دہانیاں کی گئی ہیں اس کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں ہے کہ خدا کے فرشتے ہر صبح وشام آسمان سے خوان لے کر اتریں گے اور ہمارے سامنے بچھا دیا کریں گے۔ اگرچہ ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر عام حالات میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ نہیں ہے۔ ہماری احتیاجات کی تکمیل کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا مطلب

دراصل یہ ہے کہ وہ حالات کو اس طرح ہمارے موافق بنا دے گا کہ ہم بآسانی اپنی ضروریات پوری کر سکیں ۔ وہ ایسے امکانات پیدا کرے گا جن کو استعمال کر کے ہم اپنی کاربرآری کر سکتے ہوں، وہ لوگوں کے دلوں میں ہمارے متعلق ایسے خیالات ڈالے گا کہ وہ ہمارے کام آسکیں، وہ ہمارے ذہن کو ایسی تدبیروں کی طرف لے جائے گا، جس کے بعد مسائل خود بخود حل ہوجائیں گے۔ وہ ایمان کی برکت سے ذہنی اور نفسیاتی صلاحیتوں کو ایسی جلا دے گا کہ کم صلاحیت والے بہتر صلاحیت والوں سے زیادہ کام کر سکیں گے، مقابلے کے وقت وہ ہمارے دل کو مضبوط کرے گا اور دشمن کو مرعوب کر کے شکست کو آسان بنا دے گا۔ مختصر یہ کہ ہمارے کام بھی انھیں ظاہری حالات کے اندر ہوں گے جیسے سب کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایمان کی برکت اور اللہ تعالیٰ کی توجہ کی بنا پر حالات میں کچھ ایسا غیر معمولی پن آجائے گا کہ کمتر وسائل سے ہم زیادہ کام لے سکیں گے اور معمولی ساز و سامان کے باوجود زیادہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

دوستو! یہ باتیں جو میں نے آپ کے سامنے عرض کی ہیں، یہ کوئی جذباتی نعرہ نہیں ہے اور نہ شاعری ہے۔ یہ ایک سراپا حقیقت کا اظہار ہے۔ اگر اس دنیا میں کوئی چیز ممکن ہے تو سب سے بڑا ممکن یہ ہے کہ بندہ جب خدا کی مدد کا محتاج ہو تو خدا اس کی مدد کرے۔ اس زمین و آسمان میں ہر دوسرے امکان کے بارے میں مجھے شبہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ امکان میرے لئے ہر شبہ اور تردّد سے بالاتر ہے کہ خدا اپنے ان بندوں کی مدد کرتا ہے جو اس کے دین کی مدد کے لئے اٹھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بندے کے اندر کوئی ذاتی طاقت ہے۔ بعض مذاہب کی طرح میں اس نظریے پر کوئی عقیدہ نہیں رکھتا کہ انسان اپنی ریاضت سے خدا کو یا فطرت کی برتر طاقتوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بالکل لغویات ہے۔ خدا کی مدد کو میں سب سے زیادہ قطعی اس لئے قرار دے رہا ہوں کہ یہ خدا کی اپنی صفت ہے۔ خدا کا رحیم اور قادر ہونا، اس کا خالق اور مالک ہونا لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے عاجز اور محتاج بندوں کی مدد کرے۔ یاد رکھئے کہ یہ خدا کی شانِ خدائی کے بالکل خلاف ہے کہ وہ بندوں کو عاجز و مجبور کی حیثیت سے پیدا کرے۔ اور جب بندوں کا عجز کسی ضرورت کا محتاج ہو تو وہ ان کی مدد نہ فرمائے۔ یہ خدا کی شان کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ قطعاً ناممکن ہے۔

دوستو! اگر آپ کے پاس سننے کے لئے کان ہوں تو خدا کی کتاب پکار رہی ہے ـــــ من انصاری الی اللہ (کون ہے جو خدا کے کام میں اس کا مددگار بنے) اور اسی کے ساتھ اس میں یہ ضمانت بھی موجود ہے کہ ـــــ ان تنصروا اللہ ینصرکم (اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھوگے تو خدا تمھاری مدد کرے گا) خدا آپ کو ایسے کام کے لئے پکار رہا ہے جس میں وہ خود آپ کا مددگار ہے۔ دین کی خدمت خدا کی معیت کا راستہ ہے۔ اس کی مدد سے ہم کنار ہونے کا راستہ ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو آپ کو جنت کی طرف لے جاتا ہے، اگر ایک ایسے کام کے لئے بھی آپ نہیں اٹھیں گے تو اور کس کام کے لئے اٹھیں گے۔ اور اس خدمت کے بغیر مر گئے تو خدا کا سامنا کس طرح کریں گے۔

اٹھئے کہ اس سے بڑا کوئی کام نہیں، اٹھئے کہ اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں ہو سکتی۔ ■

جماعت اسلامی ضلع اعظم گڑھ کے اجتماع میں کی گئی ایک تقریر، اوائل ۱۹۶۲

ملاپورم، کیرلا کا ایک ضلع ہے جو دہلی سے ۲۸۰۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ندوۃ المجاہدین کے اجلاس میں شرکت کے لئے ۹ مارچ ۱۹۷۹ کو یہاں پہنچا اور ۱۶ مارچ کو دہلی واپس آیا۔ ذاتی طور پر میں ایک گوشہ نشین آدمی ہوں جلسوں اور کانفرنسوں کا مجھے بالکل ذوق نہیں۔ میرا مشغلہ بس کتابیں پڑھنا ہے اور پڑھنے کے دوران میں کوئی مضمون ذہن میں آجائے تو اس کو لکھ لینا۔ تاہم بعض اوقات دوستوں اور بزرگوں کے اصرار پر "الاسلامۃ فی الوحدۃ" کے اپنے اصول کو توڑنا پڑتا ہے۔ اسی قسم کا ایک واقعہ کیرلا کا سفر بھی تھا۔

ملاپورم کا ضلع ۱۹۶۸ میں بنا۔ یہاں کی کل آبادی پندرہ لاکھ ہے جس میں گیارہ لاکھ مسلمان ہیں۔ یعنی تقریباً ستر فیصد۔ تاہم یہاں کی زمینوں اور باغات میں ان کا حصہ پچاس فی صد سے زیادہ نہیں ہے کیرلا میں تعلیم کا رواج بہت ہے۔ مگر ریاست کے گیارہ ضلعوں میں تعلیم میں سب سے پیچھے ملاپورم ہے۔ نمبودری پاد کی وزارت کے زمانہ میں مسلم لیگ نے ان سے جو تعاون کیا، اس سے مسلمانوں کو کئی فائدے ہوئے۔ ان میں سے ایک کالی کٹ یونیورسٹی کا قیام ہے۔ یہ یونیورسٹی ملاپورم ضلع کی سرحد پر ہے اور اس میں مسلمانوں کی تعداد کافی ہے۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ، اس کے اسٹاف اور طلبہ میں مسلمانوں کا تناسب نصف کے قریب ہے۔ وائس چانسلر بھی اکثر مسلمان ہوتا ہے۔ مسلم لیگ نے اس ریاست میں توازن طاقت کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس میں اس واقعہ کا بھی دخل ہے کہ یہاں کے مسلمان ووٹروں کی ۸۰ فی صد تعداد مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے متحد ہے۔

ہم لوگوں کے قیام کا انتظام اگرچہ کالی کٹ میں کیا گیا تھا۔ مگر اجلاس کا انتظام ۷۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر پولیکل میں تھا۔ گاؤں کے باہر ایک میدان میں جلسہ گاہ تھی۔ چاروں طرف ناریل کے گھنے درختوں کے جھنڈ کھڑے ہوئے تھے اور درمیان میں کھلے میدان میں پنڈال بنایا گیا تھا۔ اس قدرتی منظر نے پنڈال میں عجیب حسن پیدا کر دیا تھا۔ تقریر و خطاب کے علاوہ بعض دوسرے پروگرام بھی رکھے گئے تھے۔ مثلاً پنڈال کے ایک حصہ میں ایک نمائش کا انتظام۔ اجلاس میں عرب شیوخ ایک درجن سے زیادہ تعداد میں شریک ہوئے۔

کالی کٹ میں مسجدوں کا طرز تعمیر نرالا ہے۔ ایک مسجد پانچ منزلہ دیکھی۔ بڑے چوکور ہال کی مانند ایک کے اوپر ایک پانچ "ہال" ہیں جو جدید طرز تعمیر کے مطابق کھمبوں (Pillars) پر کھڑے کئے گئے ہیں۔ ایک اور مسجد اسی ڈھنگ پر زیر تعمیر ہے۔ وہ اور زیادہ اونچی ہوگی۔ یہ جگہ کی قلت کا حل ہے۔ زمین پر پھیلنے کی جگہ کم ہو تو عمودی اٹھان (Vertical Growth) اس کا بہترین حل ہوتا ہے۔ اسی سے قومی تعمیر کا راز بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر "سیاسی" میدان میں پھیلنے کے مواقع کم ہوں تو زندہ قومیں زندگی کے دوسرے میدان پالیتی ہیں جن میں نفوذ کرکے وہ اپنی سیاسی کمی کی تلافی کر سکیں اور بالآخر خود سیاست کو بھی اپنے دائرہ میں لے لیں۔

ندوۃ المجاہدین کے بانی مرحوم محمد کاتب طیباری (۱۸۹۱—۱۹۶۴) تھے۔ اس مجلس کے تحت بہت سے ادارے اور تعلیم گاہیں قائم ہیں۔ ان کا کام پورے کیرلا میں ہو رہا ہے۔ انھوں نے ریاست میں چودہ "عربک کالج" قائم کئے ہیں جو ان کے اہتمام میں چل رہے ہیں۔ فارغین کو "افضل العلماء" کی سند ملتی ہے جو سرکاری طور پر تسلیم شدہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ

الجامعة الندویہ کے نام سے قائم ہے۔ ان کا اپنا پریس ہے جو ملیالم نیز عربی اور انگریزی زبانوں میں کتابیں چھاپتا ہے۔ ان کا ایک عربی پرچہ نکلتا ہے جس کا نام سلسبیل ہے۔ ملیالم زبان میں المنار (ماہنامہ) اور الشباب (پندرہ روزہ) نکلتے ہیں۔ ریاست میں تقریباً دو سو مسجدیں بھی ان کے اہتمام میں ہیں نیز دار الیتامیٰ وغیرہ کے نام سے متعدد ادارے قائم ہیں۔ انھوں نے اندھوں اور بہروں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا ہے۔ سوراخ دار کاغذ جو اس قسم کے طالب علموں کے لئے ہوتے ہیں، انگریزی کے علاوہ ملیالم اور عربی میں بھی تیار کیے گئے ہیں۔ ایک اندھے بچے کے سامنے ہم نے ایک کاغذ نکال کر رکھا۔ ہمارے دیکھنے میں وہ ایک خالی کاغذ تھا جس میں متفرق طور پر چھوٹے چھوٹے سوراخ بنے ہوئے تھے۔ بچہ نے کاغذ پر انگلی پھیری اور قرات کے ساتھ پڑھنے لگا: قل ھو اللہ احد، اللہ الصمد ——— " مجھے قرآن کا وہ بیان یاد آیا، جس میں کہا گیا ہے کہ آخرت میں آدمی کی کھال تک گواہی دے گی۔ میں نے سوچا: اللہ اپنی قدرت کا ہاتھ چیزوں پر پھیرے گا اور ہر چیز اچانک وہ سب باتیں دہرانے لگے گی جو اللہ کے حکم سے اس پر نقش تھی، اگرچہ آج وہ ہم کو دکھائی نہیں دیتی۔

اس علاقہ کی ایک خصوصیت سب سے زیادہ اہم معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ یہاں قومی اور مذہبی تعصب نہیں ہے۔ اس صورت حال نے جنوب کے علاقے کو اسلامی دعوت کا نہایت عمدہ میدان بنا دیا ہے۔ یہاں کے مسلمان اگر دوسری قوموں تک اسلام کی دعوت پہنچانے میں سرگرم ہو جائیں تو اس کے عظیم الشان نتائج نکل سکتے ہیں

عرب شیوخ اور ہندستانی علماء پر مشتمل ایک قافلہ نے دو دن تک کیرلا کے مختلف ادارے دیکھے۔ کئی سو میل کے رقبہ میں قائم شدہ مدرسے، مسلم کالج، مسلم دار الیتامیٰ وغیرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کیرلا کی ریاست ایک بے حد ہری بھری ریاست ہے۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق کشمیر سے بھی زیادہ خوبصورت۔ چنانچہ ہر ادارہ ایک خوبصورت باغ میں واقع ہے۔ اس علاقہ کے مسلمانوں نے جگہ جگہ کثرت سے تعلیمی اور رفاہی ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ مثلاً یتیم خانے، اسکول، کالج، اندھوں اور گونگوں کو پڑھانا، اپاہجوں کو ہنر سکھانا، وغیرہ۔ ان اداروں میں عام طور پر قوم کے تعاون کے علاوہ حکومت سے بھی امداد لی جاتی ہے۔ اس طرح بہت بڑے پیمانہ پر قوم کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے امداد کی یہ صورتیں شمالی ہند میں بھی پوری طرح موجود ہیں اور دوسری قومیں ان کو حاصل کر کے بے شمار ادارے قائم کیے ہوئے ہیں۔ مگر شمالی ہند کے مسلمان ابھی اس امکان سے فائدہ اٹھانے میں بہت پیچھے ہیں۔ ان کے لیڈر جلسوں اور تقریروں اور مطالبوں میں مصروف ہیں اور اسی کے ساتھ ان کی قوم بھی۔ انھوں نے الفاظ کے ذریعہ سستی لیڈری حاصل کرنے کے نسخے دریافت کر رکھے ہیں۔ پھر ان کو عمل کے ذریعہ قیادت حاصل کرنے کی کیا ضرورت۔

کیرلا کے ضلع تریچور کا ایک مقام کدنگلور (Kodungallore) ہے۔ یہاں ایک قدیم مسجد ہے جس کا نام مسجد چرمان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ (۶۲۹ء) میں یہاں ایک صحابی حبیب بن مالک رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ ان کے اثر سے اس وقت کا راجہ سامری مسلمان ہو گیا۔ موجودہ مسجد اس کے لڑکے کی بنائی ہوئی بتائی جاتی ہے اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مدینہ کے بعد یہ پہلی مسجد ہے جو دنیا کے کسی مقام پر بنائی گئی۔ اس تاریخی مسجد کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور ۱۳ مارچ کو مغرب کی نماز اس مسجد میں پڑھی۔ ■

اہم اعلان

Regd. No. D. (D) 532

Regd R. N. No. 28822/76
Issue No. XXXI

June 1979

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasimjan Street, DELHI-110006 (INDIA)

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا